بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب

شمارہ مئی-2024 جلد نمبر 17

Tahreek-e-adab vol-17, issue-77 May 2024

مدیر Editor

جاوید انور (ڈاکٹر جاوید احمد) **Jawed Anwar** (Dr.Jawed Ahmad)

cell-0091-9935957330

مجلس ادارت

Editorial board and Peer Review committee

پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.

پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی

Prof.Shohab Inayat Malik HOD Urdu,Jammu University

ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہ عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)

پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی

Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)

Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)

ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔کالج، کولکاتا

Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata

ڈاکٹر احسان حسن، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان، پروفیسر عارفہ بشریٰ، رشید احمد،

عرفان عارف، ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman (Surrey, United Kingdom)

Prof. Arifa Bushra (Dept. of Urdu,Kashmir University)

Rasheed Ahmad (Chairman Rosewood Academy,VNS)

Ishtiyaq Ahmad (General Secretary, Sir syed society Varanasi)

Irfan Arif (H.O.D.Dept. of Urdu,GDC Reasi University of Jammu,

Dr.Chaman Lal Bhagat (Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu

University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

سال اشاعت: Year of Publication 2024 (جلد نمبر 17) Vol-17

شمارہ نمبر ،شمارہ 77۔مئی، 2024 Issue May

سرنامہ خطاط: انور جمال Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi

سرورق : عظمیٰ اسکرین Title cover Uzma Screen, Varanasi

فی شمارہ : دوسو روپے 200/-Two Hundred rs. per copy

زرسالانہ : دو ہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زر رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087

State Bank Of India,Branch-Shopping centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے مہاویر پریس، وارانسی سے شائع کرار دو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from mahavir press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

1۔حضرت علی اور آغوش رسول	پروفیسر ڈاکٹر عبدالمالک	5
2۔شان پیر پنچال: فاروق مضطر	روبینہ میر	37
3۔دبستان ہمالہ، دھنک اور فاروق مضطر	ڈاکٹر جاوید انور	44
4۔صحافت، زبان اور ادب	ڈاکٹر سیدہ بانو	53
5۔اعلیٰ ہستی، اسلامی اور صوفی نقطہ نظر سے	اجالا امین، ڈاکٹر نسیم گل	60
6۔اردو زبان وادب کے فروغ میں انٹرنیٹ کا رول	تنزیل اطہر	75
7۔ناظم شکارپوری کا نظمِ شعر وسخن	وفا نقوی	82
8۔سندیلہ: قدیم ادبی گہوارہ	محمد یعسوب	95
9۔شکیل الرحمٰن کے اسلوب کا مطالعہ	محمد حلیم	99
نظمیں: خالد جمال، گل جہاں، اسلم عمادی		107
غزلیں: خورشید بسمل، سہیل اقبال، ڈاکٹر بختیار نواز		110
1۔اردو افسانوں کی ہیت: اکیسویں صدی میں	ڈاکٹر احتشام عالم	113
2۔اکبر الہ آبادی کی شاعری میں تہذیبی تصادم	محبوب عالم	119
3۔موجودہ دور میں اساتذہ تعلیمی اداروں کے بی۔ایڈ طالب علم کے علم اور مہارت پہ اسکول انٹرنشپ پر پروگرام کے اثرات: ایک مطالعہ	مسرت فیضی، ڈاکٹر فخر الدین علی احمد	125
4۔انجمن دبستان ہمالہ اور کلچرل اکادمی کے اشتراک سے "خطہ پیر پنچال میں اردو ادب کے پچاس سال" کے عنوان سے جشن ادب کا اہتمام	(رپورٹ) عمر فرحت	133

Hazrat Ali aur Aaghosh-e-Rasool by Prof. Dr. Abdul Malik (Ex HOD Urdu, J.P. University Chhapra) cell-9905404622

پروفیسر ڈاکٹر عبدالمالک (سابق صدر شعبۂ اردو، جے پرکاش یونیورسٹی، چھپرہ)

حضرت علی اور آغوشِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اسلام کی تاریخ اور اس کی ادبیات کے لاکھوں سرمایے آج بھی محفوظ ہیں اور ہر ملک کی ادبی، مذہبی، سماجی، سیاسی اور غیر سیاسی مسائل صفحۂ قرطاس پر نمایاں ہیں یہاں تک کہ عرب وعجم کے اکابرین کے افکار ونظریات وتفسیر آیات کے کلمات شیطانی وسوسوں کو پاش پاش کرتے ہیں لیکن مشرق و مغرب کے حکماء ودانشوراں کے افکار وخیالات مادیّت کی تفسیر حیات بیان کرتے ہیں جب کہ عرب کی تاریخ میں حقائق ومعارف کے نظام بنو ہاشم کے گم شدہ نظریات کے آئینہ میں ظاہر ہیں جب ایام جہالت کے عِلَل واسباب نے کفر وشرک کو بلند معیار عطا کیا اور عبد ومعبود کے درمیان انقلاب پیدا کر دیا یہاں تک کہ کعبۃ اللہ کو منہدم کرنے کی سازش کی گئی تو ابرہہ در پئے عمل ہوا اور اپنی لشکر کے ساتھ پسپا ہو گیا مکہ میں بت پرستی انتہائی بلندی پر تھی جس کعبہ کی بنیاد آدم وابرہیم نے رکھی تھی اس کے اردگرد بتوں کا انبار تھا جس کی پرستش ہوتی تھی مگر افسوس ہے کہ کفر وشرک کا مدعی کعبہ کو محترم ومعظّم تصور کرتا تھا اور اس کے چاروں طرف چکّر لگانا محض آبائی طور وطریقہ سمجھا تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے عبداللہ بن عبد المطلب بن ہاشم کے یہاں حضور نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ ہاشم بن عبد مناف مدینہ کے بنی نجار خاندان کے امیر وسردار عَمرو بن لبید کی لڑکی سلمٰی سے شادی کی جن کے بطن سے شیبہ پیدا ہو امطّلب بن عبد مناف شیبہ کو مدینہ سے مکہ لائے تو عرب کے سرداروں نے پوچھا یہ کون ہے تو آپ نے برجستہ کہا کہ یہ غلام ہے! مگر اپنی بیوی سے کہا کہ یہ ہاشم کا لڑکا ہے ہاشم کا انتقال سات سال پہلے ہو چکا تھا گویا مطّلب کے کہنے کے مطابق شیبہ بن ہاشم عبدالمطلب کے نام سے مشہور ہوئے آپ نے مکہ میں فاطمہ بنت عَمرو بن عائذ سے شادی کی جن کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے پہلے ابو طالب اور دوسرے عبداللہ تھے دونوں سگے بھائی تھے اور عبداللہ کی شادی قریش کے معزز خاندان میں آمنہ بنت وہب سے ہوئی اور حضرت ابی طالب نے حضرت فاطمہ بنت اسد سے شادی کی جن کے بطن سے علی پیدا ہوئے۔ بہر کیف حضرت عبداللہ شادی کے بعد بغرض تجارت شام گئے واپس لوٹے تو

یثرب میں بیمار پڑ گئے اور چند دنوں میں داعی اجل کو لبیک کہی گویا حضور ﷺ ماں کی پیٹ میں تھے کہ والد کا ظل عاطفت سر سے ہٹا لیا گیا قضاوقدر کا فیصلہ یقیناً اٹل ہے تو فرشتوں نے خداوند عالم سے پوچھا! کہ ہمارے سردار تیرا نبی یتیم ہو گیا! تو اللہ نے کہا ہم اس کے حافظ و مددگار ہیں لیکن چھ سال کی عمر ہوئی تو سیدہ آمنہ بنت وہب اپنے شوہر حضرت عبداللہ کے مرقد کی زیارت کرنا چاہتی تھیں تو عبد المطلب سے اجازت طلب کی اور اپنے فرزند نور حق کو ساتھ لیا اور سفر میں کنیز ام ایمن بھی تھیں جو حضور ﷺ کو اپنے والد سے ورثہ میں ملی تھیں چنانچہ پیر محمد کرم شاہ الازہری نے سیرۃ الرسول جلد دوم میں یہ لکھا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

جب اس لخت جگر اور نور نظر کی عمر چھ سال ہو گئی اور غمزدہ ماں کو یقین ہو گیا کہ ان کے گلشن آرزو کا یہ گلِ رنگین اب یثرب کے طویل اور کٹھن سفر کی صعبتوں کو برداشت کرنے کے قابل ہو گیا تو انہوں نے اپنے سسر حضرت عبدالمطلب سے اپنی دیرینہ آرزو کا ذکر کیا اور اجازت چاہی کہ آپ یثرب جا کر اپنے دولہا کی قبر کی زیارت کریں جو اپنی ایک سہانی جھلک دکھا کر شب ہجر کی تاریکیوں کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لئے ان سے بچھڑ گیا۔ ا؎

بہرکیف مکہ میں بنو ہاشم کا کنبہ تھا ہاشم کی قبر کی زیارت کے لئے چھوٹا سا قافلہ دو اونٹوں پر سوار حضرت عبدالمطلب کے ننہال پہونچا اور ایک ماہ تک مقیم رہا حضرت سیدہ آمنہ بنت وہب یثرب سے مکہ واپس ہوئیں لیکن مشیت ایزدی یہ نہ تھی کہ مکہ واپس جائیں بلکہ ابواء نام مقام پہونچیں تو انتقال کر گئیں کہا جاتا ہے کہ گاؤں کے باہر ایک اونچا ٹیلہ ہے اس ٹیلے پر سیدہ آمنہ کا مزار انور ہے سیرۃ الرسول جلد دوم میں سفر یثرب کا واقعہ تفصیل کے ساتھ درج ہے ملاحظہ کیجئے۔

حضرت ام ایمن نے اس مقام پر سیدہ آمنہ کو دفن کیا پھر اپنے کریم مالک اور مہربان مالکہ کے در یتیم کو اپنی آغوش شفقت میں لیا اس جان عالم کی آنکھوں سے مسلا دھار بارش کے قطروں کی طرح ٹپکنے وا لے آنسو پونچھے اس کے دل دردمند کو تسلی دی۔ ۲؎

حضرت سیدہ آمنہ معزز خاندان بنی زہرہ کا گل سرسبد تھیں مگر قادر مطلق نے اپنے محبوب کو ایسی آغوش شفقت عطا کی جن کی صورت سیاہ فام تھی حبشن حضرت ام ایمن عبداللہ کی کنیز تھیں جو محمد ﷺ کو والد کے ترکہ میں ملی تھیں۔ مہربان خادمہ نے مقام ابواء کو خیر باد کہا اور اپنی آغوش محبت میں محمد کو لیا اونٹ پر سوار کیا اور مکہ چلی آئیں قبیلہ بنو ہاشم نے آمنہ کو نہ دیکھا تو یکا یک کہرام مچ گیا سب کے سب روتے بلکتے آنسو پوچھتے آمنہ بنت وہب کے بارے میں پوچھا! عبدالمطلب کی عمر ایک سو اڑتیس سال کی تھی

بوڑھاپے میں بہوکو نہ پایا تو غم واندوہ کا پہاڑ اچانک ٹوٹ پڑا نڈھال ہو گئے پوتے کو گود میں لیا بارگاہ ایزدی میں دعائے خیر کے لئے ہاتھ اٹھایا اور شب وروز اپنی آغوش شفقت میں رکھا اپنے کندھے پر اٹھائے کعبہ کے گرد وپیش طواف کیا اور کبھی غلاف کعبہ کو پکڑا تو پروردگار سے محمد ﷺ کی عمر دارزی کی دعا مانگی کھانا کھاتے تو ساتھ کھاتے سوتے تو ساتھ سلاتے چونکہ حضرت فاطمہ بنت عَمرو بن عائذ انتقال کر چکی تھیں جن کی کوکھ سے ابوطالب وعبداللہ پیدا ہوئے تھے جب حضور نور مجسم ﷺ کی عمر آٹھ سال کی ہوگئی تو قدرت خداوندی نے عبدالمطلب کو دنیا سے اٹھالیا نہ ماں تھیں نہ باپ تھے نہ دادی تھیں نہ دادا تھے گویا سب داغ مفارقت دے گئے آخر کار حضر فاطمہ بنت اسد نے اپنی آغوش شفقت میں لیا سید سلیمان ندوی کی کتاب خلفائے راشدین کا متن ملاحظہ کیجئے:۔

حضرت علی کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بنت اسد نے بھی آمنہ کے اس یتیم معصوم کی ماں کی طرح شفقت ومحبت سے پرورش کی مستند روایات کے مطابق وہ مسلمان ہوئیں۔ ۳؎

لیکن عبدالمطلب نے وفات سے پہلے ابوطالب کو بلایا اور وصیت کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کی نگہبانی کرنا اپنے بچوں سے زیادہ پیار کرنا ہمہ وقت ان کا خیال رکھنا ابوطالب کی بیوی فاطمہ بنت اسد نے بڑی محبت وشفقت سے حضور کی خدمت کی گویا والد کی وصیت کے مطابق نگہداشت کی سعادت ابوطالب کے حصے میں آئی تھی جب کھانا کھاتے تو حضور کو ساتھ بیٹھاتے تو آپ کی شمولیت کی برکتیں بھی ظاہر ہوتیں اور کبھی دستر خوان پر حضور نہ ہوتے تو کھانا پورا نہ ہوتا اور لڑکے بھوکے رہ جاتے اس لئے عم محترم فرماتے کہ اے میرے بیٹے! تو بڑا برکت والا ہے جب حضور کی عمر شریف نو دس سال کی ہوئی تو اُس وقت ابوطالب کی مالی حالت اچھی نہ تھی جائداد تھی مگر دولت نہ تھی جاہ ومنزلت تھی مگر بے بسی اور بے کسی کا عالم تھا اہل وعیال کی کثرت نے پریشان کر دیا تو حضور ﷺ نے قراریط کے عوض بکریاں چرایا یعنی اجرت کے طور پر دودھ کا حصّہ لیتے اور چچا کے اہل وعیال کے ساتھ غذا کے طور پر استعمال فرماتے بہرحال ابوطالب نے والد کے عہد وپیمان کو عمر بھر نبھایا گویا ابوطالب بے مثال خوبیوں اور عظیم صلاحیتوں کے مالک تھے بہرکیف محمد کی ذات سراپا رحمت تھی والد کی وصیت کو دل کی گہرائیوں سے قبول کیا تھا تو حضور ﷺ کی حقانیت اور حسن وجمال نے اپنا گرویدہ بنالیا تھا بہرحال عبدالمطلب کی وصیت کے کلمات کا متن سیرۃ الرسول جلد دوم میں ملاحظہ کیجئے:۔

وفات سے پہلے آپ نے اپنے بیٹے حضرت ابوطالب کو بلایا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نگہداشت اور خدمت ان کے سپرد کی کیوں کہ آپ حضرت عبداللہ کے سگے بھائی تھے دونوں فاطمہ بنت عَمرو

بن عائذ کے بطن سے تولد ہوئے تھے۔ ۴؎

چنانچہ ابو طالب اپنے والد عبد المطلب کہ کہنے کے مطابق حضور ﷺ کی خدمت میں دیدہ و دانستہ کبھی بھی کوتاہی نہیں کی بلکہ ہر حال میں آپ کی نگہداشت کی عظمت کا خیال رکھا اور شب و روز کے مشاہدہ میں، سفر و حضر کے تجربے میں ان کی عظمت کا اعتراف بھی کیا چونکہ بنو ہاشم میں تثلیث فاطمہ کا کردار تاریخ اسلام میں اسلامی رنگ پیدا کرتا ہے اور بنی نوع انسان کے درمیان متفرق حالات کے باوجود اپنی انفرادی نوعیت کے اعتبار سے اہم معنی رکھتا ہے بلکہ بنو ہاشم کی نظریات کے آئینے میں اس کی تاریخی حقیقت کا جوہر عطا کرتا ہے یعنی اخلاق و حکمت، انسانیت و موعظت کا بے مثل مجموعہ ہے جس سے اسلامی زندگی کے بے شمار نکتے حل کئے جا سکتے ہیں یعنی فاطمہ بنت عَمرو، فاطمہ بنت اسد اور فاطمہ بنت رسول ہیں جن کے ارد گرد عرب کی واردات کا کافی ذخیرہ ہے جو اردو زبان و ادب کے لئے سرچشمہ اَزل اور مجموعۂ ادب ہے بہر حال حضور ﷺ کی عمر بارہ تیرہ سال کی ہوئی تو ابو طالب تجارت کی غرض و غایت سے سفر شام پر روانہ ہوئے تو گزشتہ پری وش کلمات کو پس پشت ڈالنا چاہا تو بلوغ کی منزل سے پہلے جذبات کی فطری خوبیاں ابھریں اور نہایت دلکش نور پیکر کی رعنائیاں کلمہ و کلام کی صورت میں برسر عام ہوئیں بلکہ اپنی عقیدت مندی کی شان و شوکت کو ظاہر کیا تو علامہ ابن خلدون کا بیان اس قدر عمدہ اور حیرت انگیز ہے کہ تنگ دائرے میں اُنٹنی کی مہار پکڑ لی اور دادکی وصیت اور چچا کی آغوش شفقت کا ذکر کیا اور ان کی سرپرستی کی بناء کو طرۂ امتیاز عطا کیا اور چچا نے لپک کے اپنی اونٹنی پر بیٹھا لیا اور سفر شام پر روانہ ہو گئے ابن خلدون کی مصدقہ روایت ملاحظہ کیجئے:۔

سفر شام پر روانہ ہوئے تو حضور نے اُنٹنی کی مہار پکڑ لی اور کہا اے میرے چچا! آپ مجھے کس کے سپرد کر کے جا رہیں میرا نہ باپ ہے اور نہ ماں!۔ ۵؎

بہر کیف حضرت ابو طالب محمد ﷺ کو اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہو گئے اور کئی دنوں کے بعد بُصریٰ پہنچے اور عیسائی خانقاہ کے قریب قیام کیا! کہا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پہچان و شناخت کا علم قادر مطلق نے عطا کیا تھا اور حواریوں نے اس علم کو مکتوب میں محفوظ کر رکھا تھا جو نسلاً بعد نسل راہبوں کے پاس تھا چنانچہ عیسائی راہب جرجیس نامی عرصہ دراز سے منتظر تھا جس کو ہم بحیریٰ کہتے ہیں گویا بحیریٰ سریانی لفظ ہے جس کا معنی عبقری اور نابغہ ہے یعنی نہایت ذی شعور، نہایت دانشمند اور علامۂ روزگار ہے اس نے اپنی خانقاہ سے قریش کے تجارتی قافلہ کو دیکھا کہ ایک بچہ کے سر پر بادل کا ٹکڑا سایہ فگن ہے تو اچانک حیرت زدہ ہو گیا اور بار بار قافلہ دیکھتا اور اپنی

کتاب میں مکتوب کی سطر کو دیکھتا بہرحال قریشی قافلہ بُصری کے وادی میں ایک درخت کے سایہ میں قیام پذیر ہوا تو اس نے دیکھا کہ بچہ درخت کے سایے سے الگ بیٹھا یہاں تک کہ اس کے چہرۂ انور پر سورج کی تمازت پڑی تو سایہ دار درخت اس کی طرف جھک کر ادب بجالایا اور سایہ فگن ہوگیا۔ یہ منظر دیکھ رہا تھا اور حیرت زدہ تھا! کہ پانچ سوسالہ پیغمبر کے لب و لہجے کی زرّیں نگارشات کے انکشاف نے حیرت انگیز مشاہدہ میں مبتلا کردیا! آخر کار اپنی خانقاہ سے نکلا اور قریشی قافلہ کے لوگوں کو دعوت دیا کہ آج ہمارے یہاں سب لوگ کھانا کھائیں بہرحال سب لوگ گئے مگر بچہ قریشی قافلہ کے سامانوں کی حفاظت کررہا تھا راہب نے تمام لوگوں کا خیر مقدم کیا مگر جس کے طفیل میں عزت ملی تھی قریشی اپنی فہم سے سمجھ نہ سکے بالآخر اس نے پوچھا کیا کوئی پیچھے رہ گیا! تو حضور کے چچا حارث بن عبدالمطلب محمد کو بلانے گئے اور آپ کو ساتھ لائے تو راہب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دیکھنے میں متوجہ ہوا اور پیغمبر کے ارشاد کی محویّت میں گم ہوگیا یہ کورانہ تقلید تھی کہ آگے پیچھے سب کچھ بھول گیا ہاں! کچھ دیر کے بعد ہوش میں آیا تو ابوطالب کو سامنے پایا تو ادب سے پوچھا کہ یہ بچہ آپ کا کون ہے تو ابوطلب نے کہا میرا بیٹا ہے کہا آپ کا بیٹا نہیں اور نہ اس کا باپ زندہ موجود ہوسکتا ہے! تو حضرت ابوطالب نے کہا یہ میرا بھتیجا ہے تو اس نے پوچھا کہ اس کا باپ کہاں ہے! تو ابوطالب نے کہا آپ شکم مادر میں تھے تو والد کا انتقال ہوگیا تو پوچھا کہ ماں کہاں ہیں! تو ابوطالب نے کہا کہ آپ کی عمر چھ سال کی ہوئی تو ماں کا انتقال ہوگیا تو بحیریٰ نے کہا آپ نے واقعی سچی بات کہی ہے گویا راہب نے اس کی تصدیق کی اور ادب واحترام کے ساتھ کہا کہ آپ اپنے بھتیجے کو وطن واپس لے کر چلے جائیں اس لئے کہ توریت وانجیل میں ان کی نشانیاں مذکور ہیں اور یہودیوں سے ہوشیار رہیں وہ گزند پہونچا سکتے ہیں گویا ابوطالب نے مژدۂ حق کے کلمات کو علامۂ روزگار سے سنا! کہ **ھذٰا سید الغلمین ھذٰا رسول رب العالمین ھذٰا یبعث اللہ رحمۃ للعالمین**۔ (یہ سارے جہانوں کے سردار ہیں یہ رب العالمین کے رسول ہیں انہیں اللہ تعالیٰ رحمت للعالیمن بنا کر مبعوث فرمائیگا۔) لیکن سید امیر علی کی کتاب کا اردو ترجمہ تاریخ اسلام میں یوں مذکور ہے جس کا متن ملاحظہ کیجئے:۔

آپؐ نے اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ دو مرتبہ شام کا سفر کیا تھا وہاں آپ نے عوام کی دکھ بھری زندگی کو دیکھا تھا آپ نے ان کی برائیوں اور شرپسندیوں کو بھی دیکھا تھا پچیس سال کی عمر میں آنحضرتؐ نے حضرت خدیجہ سے شادی کی۔۶؎

بہر کیف شام کی طرف دوسرا سفر کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت خود مختار کی تھی غالباً ماہ

ذی الحجہ میں قافلہ شام کے لئے روانہ ہوا تو حضور کے تمام چچا صاحبان الوداع کے لئے حاضر ہوئے چند روز کے بعد قافلہ بُصریٰ کے وادی میں پہونچا اور سایہ دار درخت کے پاس قیام کیا جہاں حضور ﷺ تیرہ سال قبل آئے تھے اور بحیریٰ راہب سے ملاقات ہوئی تھی یہاں عیسائیوں کی خانقاہ تھی مگر بحیری راہب نہ تھا البتہ دوسرا راہب نسطورا تھا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو خود وارفتہ ہو گیا اور بے حد متحیر ہوا تو غلام میسرہ سے دریافت کیا! حضرت خدیجہ بنت خویلد کا غلام میسرہ تھا حضرت خدیجہ بنت خویلد نے غلام بھیجا تھا کہ سفر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور تاکید بھی کیا تھا کہ ''آپؐ کی نافرمانی نہ کرنا اور کسی رائے کی مخالفت نہ کرنا'' چنانچہ راہب نسطورا قریب آیا تو یکا یک سر مبارک کو بوسہ دیا اور قدم بوس ہوا اور آپ پر ایمان لایا اور کہا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں نبی امی ہیں جس کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی ہے۔

بہر حال حضور شام تشریف لے گئے اور مکہ سے جو سامان لائے تھے اس کو فروخت کیا اور شام کی مصنوعات کے ساتھ مغربی ممالک کے اشیاء کو بھی خریدا اور مکہ کے لئے واپس ہوئے جب ظہران نام مقام پر پہونچے تو میسرہ کو کہا! پہلے جاؤ اور اپنی مالکہ کو تجارت کے سفر کی خوشخبری سناؤ! میسرہ پہونچا تو حضرت خدیجہ سے طویل سفر میں جو کچھ ہوا تھا! کہا اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری و باطنی کمالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا بتایا! نسطورا راہب کی وارفتگی کا اظہار کیا اور نسطورا کی پیش گوئی کو بیان کیا! اس کے علاوہ موقع و محل کے اعتبار سے معاملہ فہمی، حسن عمل، کاروباری مہارت کا تذکرہ کیا تو حضرت خدیجہ نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ اگر میں انکی رفیقۂ حیات بن جاؤں تو میری خوش نصیبی ہوگی چنانچہ اپنی سہیلی نفیسہ بنت منیہ کو مامور کیا کہ شادی کے متعلق رائے طلب کرے تو نفیسہ نے پوچھا کہ آپ شادی کیوں نہیں کرتے! تو آپ ﷺ نے کہا کہ ''میرے پاس سرمایہ نہیں جس سے شادی کا فریضہ ادا کر سکوں'' تو نفیسہ نے برجستہ کہا کہ اس کی فکر نہ کریں اس کی میں ذمہ دار ہوں اور نفیسہ نے عہد جاہلیت میں دولت مند تاجرہ، لقب طاہرہ، شریف النفس، رحم دل حضرت خدیجہ بنت خویلد کا منسوب پیش کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا میرے لئے یہ کیوں کر ممکن ہے!

حضرت خدیجہ نے حضورؐ کو دعوت دی اور ازدواجی زندگی کے لئے ادب و احترام کے ساتھ اپنی خواہش کا اظہار کیا تو حضورؐ نے قبول کر لیا جب خدیجہ کو یقین کامل ہو گیا کہ میری درخواست حضور مسترد نہیں فرمائیں گے تو خدیجہ نے ادب کے ساتھ کہا کہ آپؐ اپنے چچا جان ابو طالب کے پاس تشریف لے جائیں اور کل اپنے چچا کو میرے یہاں بھیجیں جب دوسرے دن حضرت ابو طالب گئے تو

حضرت خدیجہ نے کہا میرے چچا کے پاس تشریف لے جائیں اور اپنے بھتیجے کے لئے میرا رشتہ طلب کریں دونوں بزرگوں نے منظور کیا اور نکاح کی تاریخ طے ہوگئی۔ چنانچہ پیر محمد کرم شاہ الازہری نے سیرۃ الرسول جلد دوم میں یہ لکھا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

مقررہ تاریخ پر قبیلہ مضر کے رؤساء مکہ کے شرفاء اور امراء اکٹھے ہوئے حضرت خدیجہ کی طرف سے ان کے چچا عمرو بن اسد وکیل بنے حضرت ابوطالب نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے وکالت کا فریضہ انجام دیا آپ نے ایک فصیح وبلیغ خطبہ نکاح ارشاد فرمایا۔۔۔۔۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس کی قرابت کو تم خوب جانتے ہو اس نے خدیجہ بنت خویلد کا رشتہ طلب کیا ہے اور ساڑھے بارہ اوقیہ سونا مہر مقرر کیا ہے اور بخدا مستقبل میں اس کی شان بہت بلند ہوگی اس کی قدر و منزلت بہت جلیل ہوگی۔ ۷؎

حضرت ابوطالب نے اپنے والد کی وصیت کے مطابق اپنی کفالت میں رکھا اور غور وفکر کے ساتھ برادرزادہ کو عزیز ترین سمجھا یہاں تک کہ حضرت خدیجہ بنت خویلد کا رشتہ طلب کیا اور پچیس سال کی عمر میں خطبۂ نکاح خود ارشاد فرمایا حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چچی فاطمہ بنت اسد کے متعلق فرمایا کہ میری والدہ انتقال کر گئیں تو انہوں نے ماں کی طرح میرا خیال رکھا چنانچہ فاطمہ بنت اسد اہلیہ ابوطالب نے کہا کہ جب میرا بچہ پیدا ہوا تو کچھ منہ میں نہیں لیتا تھا تو محمد بن عبداللہ کو بلایا اور کہا ذرا دیکھو! یہ بچہ کس قدر حسین وجمیل ہے! معصوم ہے! مگر کچھ کھاتا نہیں! سیرۃ الرسول جلد دوم کے مصنف پیر محمد کرم شاہ الازہری نے یہ لکھا ہے اس کا متن ملاحظہ کیجئے:۔

جب میرا یہ بچہ پیدا ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام علی رکھا۔ اور اس کے منہ میں اپنا لعاب دہن ڈالا اور اپنی زبان مبارک اس مولود مسعود کو چوسنے کے لئے اس کے منہ میں ڈالی جسے یہ بچہ چوستا رہا یہاں تک کہ سو گیا۔ ۸؎

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابوطالب کو اپنی آغوش میں لیا اور نام علی رکھا اور منہ میں لعاب دہن ڈالا منبع علم وحلم کی دولت عطا کی یعنی دین و دنیا کی پہلی کامرانی فرشتہ صفت، معصوم بچہ کو آغوش رسول میں ملی صحابہ کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ کے دہن مبارک سے نور نکلتا تھا یہاں تک کہ معصوم بچہ کا آئینہ دل اس قدر صاف وشفاف تھا کہ علوم ظاہری و باطنی، کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس سے ممتاز کیا ابوعمر وکا کہنا ہے کہ وہ ہاشمی خاندان کی پہلی خاتون ہیں جن کے بطن سے ایک ہاشمی پیدا ہوا بلکہ یہ کہا جائے تو بنی سعد کی زبان میں ایک فصیح وبلیغ جملہ ہوگا کہ ابتدا ہی سے رسالت مآب کی آغوش میں علم ربانی کی تربیت پائی گویا مولا علی کی رگِ حمیّت وکمیّت کا موزانہ ممکن ہی نہیں وہ بے مثل ہیں وہ

علوم ظاہری و باطنی کے منبع و مرکز ہیں اور جتنے بھی اہل سنت کے سلاسل موجود ہیں اس کی ابتداء وانتہا مولائے کائنات ہیں اگر دین و دنیا کے علم و فضل کے ہزار دروازے ہو سکتے ہیں تو سرور کائنات نے علی با بھا کہہ کر ممتاز کر دیا اور علی کے قلب کو ہر قسم کی آلائشوں اور آلودگیوں سے پاک کر دیا بہر حال ابو طالب کثیر العیال تھے تو حضور ﷺ اپنے چچا عباس کے پاس تشریف لے گئے اور کہا کہ ابو طالب کے چار لڑکے ہیں اور سب ایک دوسرے سے دس دس سال چھوٹے ہیں اگر ہم لوگ ایک ایک لے لیں تو ان کا بوجھ ہلکا ہو جائیگا چنانچہ ابو طالب نے کہا کہ طالب و عقیل کو میرے پاس رہنے دو اور باقی دو کے بارے میں آپ لوگوں کی جو مرضی ہو کریں! بہر کیف سیرۃ الرسول جلد دوم کے مصنف پیر محمد کرم شاہ الازہری نے یہ لکھا ہے اس کا متن ملاحظہ کیجئے:۔

چنانچہ حضرت علی کو جو سب سے کمسن تھے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کفالت میں لے لیا اور جعفر کو عباس اپنے ساتھ لے گئے اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت علی کو اعلان نبوت سے پہلے ہی آغوش نبوت میں پہنچا دیا تا کہ یہ قطرہ، صدف احمدی میں پرورش پا کر درشہوار بنے اپنے علمی اور روحانی انوار ساطعہ سے تا قیامت اکناف عالم کو منور اور روشن کرتا رہے۔۹؎

بہر حال علی ابن ابی طالب کو حضور ﷺ نے اپنی آغوش میں لے لیا جب نو دس سال کی عمر ہوئی تو رجوع الی اللہ کی کیفیت میں رکوع و سجود کا منظر دیکھا بلاذری نے لکھا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت آپ کی عمر کم تھی مگر لکھنا اور پڑھنا خوب جانتے تھے بنو ہاشم کے چشم و چراغ کی فطرت سنور چکی تھی گو یا مشیت یزدی یہی تھی کہ کاشانۂ نبوت نے برادرہ زادہ کو دائمی وارث کا مژدہ سنایا اور علم و آگہی کا خلعت فاخرہ عطا کیا! اس کی پیدائشی فطرت سرمدی تھی اور اس کی سرشت میں نور الٰہی کی فرماں برداری تھی تو حضرت علی نے بچپن میں وحدہ لاشریک کی عبادت کا طریقہ وسلیقہ دیکھا! سمجھ میں نہ آیا تو پوچھا آپ لوگ کیا کر رہے تھے چنانچہ سید سلیمان ندوی نے خلفائے راشدین میں یہ لکھا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

چنانچہ ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کو مصروف عبادت دیکھا، اس مؤثر نظارہ نے اثر کیا، طفلانہ استعجاب کے ساتھ پوچھا، آپ دونوں کیا کر رہے تھے؟ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے منصب گرامی کی خبر دی اور کفر و شرک کی مذمت کر کے توحید کی دعوت دی حضرت علی کے کان ایسی باتوں سے آشنا نہ تھے متحیر ہو کر عرض کی اپنے والد ابو طالب سے اس کے متعلق دریافت کرونگا۔۱۰؎

حضرت علیؓ نے کہا کہ میں اپنے والد بزرگوار سے دریافت کرونگا تو حضور ﷺ نے فر

مایا اگر تجھے تامل وتوقف ہے تو غور کرو، فکر کرو! چونکہ اعلان عام منظور نہ تھا اور یہ بھی کہا کہ کسی سے اس کا تذکرہ نہ کرنا اس لئے کہ حضرت علیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش رحمت میں آنکھ کھولی تھی اور نور ہدایت کا سرچشمہ آغوش رسالت سے حاصل کی تھی اور تزکیۂ نفس کی حقیقت ملی تھی گویا علم وحدانیت ورسالت کی آگاہی تھی بس رات ہوئی اور علم وآگہی نے مشاہدہ کیا کہ ''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا پس اس نے اپنے رب کو پہچانا گویا توفیق الٰہی شامل ہوئی اور صبح ہوئی تو بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے کلمہ وحدانیت ورسالت پڑھا اور مشرف باسلام ہوئے۔ گویا حضرت خدیجہ کے بعد علی بچوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں فی الحقیقت اسلام کے علوم ومعارف کا سرچشمۂ ہدایت قرآن مقدس ہے تو سید سلیمان ندوی نے لکھا کہ آپ کو قرآن زبانی یاد تھا! بلکہ اس کی ایک ایک آیت کے معنی اور شان نزول سے واقف تھے ابن سعد کا کہنا ہے کہ ایک موقع پر آپ نے کہا کہ میں ہر آیت کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ یہ کہاں اور کیوں اور کس کے حق میں نازل ہوئی ۔ بہرکیف مولائے کائنات کی دس سال کی عمر تھی ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کو عبادت کرتے دیکھا قیام ورکوع وسجود وقعود کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو حیرت ہوئی تو پوچھا آپ دونوں کیا کر رہے تھے سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ رکوع وسجدہ سے حضرت علی ابن ابی طالب مراد ہیں اور ''اس سے علیؓ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کیونکہ رکوع وسجود تمام صحابہؓ کا مشترکہ وصف تھا پھر اس اشتراک میں تخصیص سے معلوم ہوا کہ اس اشتراک کے باوجود انکو اس باب میں کچھ مزید امتیاز حاصل تھا'' چنانچہ قرآن نے سورہ فتح میں بیان کیا اور کہا کہ توریت وانجیل میں عبادت کی صفتیں بیان کی گئی ہیں القرآن حکیم میں سورہ فتح کی آیت کا ترجمہ فاضل بریلوی امام احمد رضا خاں کا ملاحظہ کیجئے:۔

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ والے، کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل، تو انھیں دیکھے گا، رکوع کرتے، سجدہ میں گرتے، اللہ کا فضل ورضا چاہتے ہیں ان کی علامت، ان کے چہروں میں ہے، سجدوں کے نشان سے یہ ان کی صفت توریت میں ہے اور ان کی صفت انجیل میں ہے۔[11]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے داعی برحق کی حیثیت سے تین برس تک علانیہ دعوت اسلامی کی تبلیغ نہیں کی البتہ پوشیدہ طریقہ پر خاص خاص لوگوں کو اس کی ترغیب دیتے رہے چنانچہ بعثت کے بعد ابوبکر ایمان لائے اور بعثت کے دوسرے سال میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ایمان لائے اور اس کے

تیسرے دن حضرت عمرابن الخطاب بصداحترام دارارقم میں جا کرایمان سے مشرف اسلام ہوئے گویا دوسرے اور تیسرے سال عثمان بن عفان، زہیر بن العوام، عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبداللہ، عبداللہ بن مسعود، خالد بن سعید العاص، ابوذرغفاری، صہیب اور عمران بن حصین بیٹا اور باپ ایمان لائے چوتھے سال اسلام کے اعلان عام سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے قریبی رشتہ دار کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں القرآن حکیم کے سورۂ شعراء کا ترجمہ فاضل بریلوی امام احمد رضا خاں نے کیا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

وَاَنذِر عَشَیرَتَکَ الاقربین O اے محبوب اپنے قریب تر رشتہ داروں کو ڈراؤ شعرا۔ ۱۲؎

چنانچہ حضور ﷺ خود کوہ صفا پر چڑھ گئے اور عرب کے قبیلوں کو، اپنے عزیزوں کو، کوہ صفا کے دامن میں جمع کیا اوان کے سامنے دعوت حق کی صدا بلند کی تو یکا یک وحدانیت کی آواز گونج گئی اور ہر قبیلہ کو اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا علم ہوا مگر سب لوگوں نے انکار کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ غم گین ہوئے اور چند روز تک غور وفکر کرتے رہے یہاں تک کہ حضور ﷺ نے اپنے خاندان والوں کو اسلام کی تبلیغ کی خاطر پھر کوشش کی اور اپنے رشتہ داروں کو گھر پر دعوت دی اور حضرت علیؓ منتظم کار کی حیثیت سے مامور ہوئے مورخین ومحدثین نے لکھا ہے کہ علی کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی مگر کھانے کے لئے پر تکلف انتظام کیا خلفائے راشدین کا متن ملاحظہ کیجئے:۔

حضرت علی کی عمر اس وقت مشکل سے چودہ پندرہ برس کی تھی لیکن انھوں نے اس کمسنی کے باوجود نہایت اچھا انتظام کیا، دسترخوان پر بکرے کے پائے اور دودھ تھا دعوت میں کل خاندان شریک تھا جن کی تعداد ۴۰ تھی حضرت حمزہ، عباس، ابولہب، اور ابوطالب بھی شرکاء میں تھے لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اٹھکر فرمایا۔ ۱۳؎

مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا کہ سب نے کھایا مگر کسی نے وحدہ لاشریک کا اقرار نہیں کیا چوتھے سال اعلان عام کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ کا حکم ہوا آپ ﷺ کو کفاران مکہ نے بے حد پریشان کیا جس سے ہولناک ظلم وستم کی روح فرسا داستانیں وجود میں آئیں اور مکہ والوں نے ظلم وستم، جبر واستبداد اور مکر وابا کے فتنے پیدا کئے یہاں تک کہ غیظ وغضب کے پھندے ہر طرف بچھائے گئے اور مسلمانوں کو مارا پیٹا گیا اور سخت مجروح کیا گیا کفاران مکہ فلسفۂ اسلام کے خلاف شب وروز مشتعل ہو گئے تو اللہ کے رسول نے مسلمانوں کو حبشہ کی ہجرت کا حکم دیا مصائب وآلام کے باوجود آپ کے عزم وارادہ میں کوئی لچک پیدا نہیں ہوئی مگر کفاران مکہ نے وحشیانہ جبر وتشدد اختیار کیا اور

متفقہ طور پر تمام قبائل کے نمائندوں نے سوشل بائیکاٹ کا پروگرام بنایا چنانچہ منصور بن عکرمہ بن عامر نے ظالمانہ عہد نامہ لکھا جس پر تمام قبائل کے نمائندوں نے دستخط کئے اور کعبہ شریف کے اندر آویزاں کیا بہر کیف ابو طالب بہت ہی دور اندیش آدمی تھے اور ہر موقع و محل میں ثابت قدم اور ساتھ رہے جب کافروں کی سازش کا پتہ چلا تو حضور ﷺ کی حفاظت کا خیال آیا قدیم و جدید دور میں محاصرہ کا پیمانہ بڑا کارآمد سمجھا جاتا تھا اور آج بھی سمجھا جاتا ہے البتہ آج کے دور میں لفظ محاصرہ کی جگہ نظر بندی نے لے لی ہے قدیم زمانے میں قلعہ کا محاصرہ جنگ جو کیا کرتے تھے چنانچہ ابو طالب نے عرب میں لفظ محاصرہ کے انتباہ کو دیکھا تھا اور سمجھا کہ فرداً فرداً گھروں کا محاصرہ کافروں نے کر لیا تو ہم لوگ ایک دوسرے کی مدد نہیں کر پائیں گے اس لئے آپس میں طے کیا کہ ہم لوگ ایک ہی جگہ قیام کریں اور سکونت پذیر ہو جائیں چنانچہ اپنے گھروں کو چھوڑا اور جو ورثہ میں گھاٹی ملی تھی اپنے پیارے بھتیجے اور بنی ہاشم کی معیت میں شعب ابی طالب میں منتقل ہو گئے یہ محاصرہ ساتویں سال ماہ محرم میں شروع ہوا تین سال تک جاری رہا گویا کاشانۂ نبوت کا سخت ترین محاصرہ تھا اس وقت علی کی عمر ۱۷ تا ۱۹ سال تھی یہ طویل محاصرہ حضور ﷺ اور ان کے خاندان کے لئے بہت تکلیف دہ تھا لیکن ہشام، مطعم، زہیر، اور ابو بختری نے مل کر صحیفہ کو ٹکڑا ٹکڑا، پرزہ پرزہ اور ریزہ ریزہ کر دیا اس طرح تین سال کے بعد سنگین محاصرہ سے نجات ملی چنانچہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:۔

حضرت علی مرتضی کے والد ابو طالب مکہ کے نہایت ذی اثر بزرگ تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی کی آغوش شفقت میں پرورش پائی تھی اور بعثت کے بعد ان ہی کے زیر حمایت مکہ کے کفرستان میں دعوت حق کا اعلان کیا تھا ابو طالب ہر موقع پر آپ کے لئے سینہ سپر رہے۔ ۱۴؎

حضرت ابو طالب کی زندگی میں کافرانہ صحیفہ پاش پاش ہوا اور محاصرہ ختم ہو گیا تو بنی ہاشم کو ساتھ لیا اور شعب ابی طالب سے نکل کر اپنے اپنے گھروں میں چلے آئے مگر قضا و قدر کا فیصلہ بڑا مایوس کن ثابت ہوا یعنی قدرت الٰہی کی حکمتوں کا احاطہ ممکن نہیں ابھی پورا مہینہ گزرا نہیں کہ ابو طالب کا انتقال ہو گیا اور ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا کہ ام المومنین حضرت خدیجہ نے اجل کو لبیک کہی یہ سال غم و اندوہ کا سال تھا مزید تین سال تک مکہ میں رہے آخر کار اللہ تعالیٰ نے ہجرت کا حکم دیا تو امام حسن عسکری نے اپنی تفسیر میں نقل کیا کہ حضور ﷺ نے خلوت خاص میں علی کے متعلق کلمات طیبہ سے پردہ اٹھایا اور خانوادۂ رسالت کے اسرار کو رازداں اور امین کہا! اس میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ کاشانۂ نبوت میں علی کے حسن عمل کی پیکر تراشی کی گئی تھی تو پیمانہ کردار بے مثل قرار پایا یعنی جس کی فطرت

شناسی کی تدوین بلاغت لعاب دہن سے کی گئی تھی محض نو سال کی عمر میں غور وفکر کے آنگن میں اسرار و رموز کے سارے نکات باہم قدم بوس تھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آئی یہ تثلیث فاطمہ کی تمجیدی نگارش کی پہلی کامرانی تھی گویا بنو ہاشم کا چشم و چراغ حقائق ومعارف کا پروردہ تھا اسلام میں علم کا مفہوم ومنشا اس قدر وسیع ہے کہ اس کی وضاحت پیغمبری لب ولہجہ میں صحابہ نے سنا کہ علم کی نیابت علی کے حصے میں عطا کی گئی ہے گویا دینی ودنیوی علوم کی تکمیل بغیر علی کہ ممکن نہیں چونکہ پیغمبری لب ولہجہ کے انتخاب عمل نے وضع کیا تھا تو ظاہری و باطنی علوم کے مفہوم ومنشا کی تلاش خلفائے راشدین، محدثین، تبع تابعین نے کی یہاں تک کہ اکابرین سلف نے سلاسل کی ترتیب دی تو منتہائے کمال علی تک جا پہونچی مراقبہ ومشاہدہ میں گر اصل کا سایہ ممکن نہیں تو علوم ومعارف کے آئینہ کا عکس یقینا ہے بہر کیف حضرت امام حسن عسکری کی عبارت کو سیرۃ الرسول جلد سوم کے مصنف پیر محمد کرم شاہ الازہری نے یہ نقل کیا ہے اس کا متن ملاحظہ کیجئے:

اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آج رات اپنے بستر پر حضرت علی کو سلائیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا کہ ان کا تعلق آپ کے ساتھ ایسے ہی ہے جیسے حضرت اسحاق ذبیح کا تعلق حضرت ابرہیم خلیل سے تھا علی نے اپنے نفس کو آپ کی ذات پر فدا کر دیا اور اپنی روح سے آپ کی حفاظت کی ہے۔ ۱۵؎

آخر کار وہ وقت آ گیا کہ ہجرت سے چھ سال پہلے ابو طالب نے محاصرہ کے انتباہ سے گھبرا کر آبائی گھر چھوڑا تھا اور ایک مثبت قدم اٹھایا تھا اور سارے لوگوں کو شعب ابی طالب میں منتقل کر دیا تھا سنو! ہجرت کی شب ابو طالب زندہ نہ تھے گھر میں صرف علیؓ ابن ابی طالب تھے سرور کائنات ﷺ کی نگاہ اولین والآخریں نے فیصلہ کر دیا کہ بنو ہاشم کا چشم و چراغ میرے بستر پر سوئے چونکہ برادر زادہ ہے اور میرا وارث ہے اس کی وراثت پر یقین کامل ہے اور اس کی امانت پر امام الانبیاء کو بھروسہ ہے جو رسول کا حکم ہوگا اس کو علی من وعن پورا کریں گے پہلے مکہ والوں کی امانت علی کو سپرد کیا چونکہ کفار ان مکہ آپ ﷺ کی صداقت وامانت کے قائل تھے اور اسلام کے لئے اہل عرب کی حکمت عملی امانت تھی کفار کہتے کہ محمد جو کہتے ہیں سچ کہتے ہیں جس کا مداح قادر مطلق ہے بصریٰ کے وادی میں ابو طالب نے صومعہ کے راہب سے سنا تھا! کہ آپ نبی امی ہیں جن کا ذکر توریت وانجیل میں مذکور ہے چنانچہ قادر مطلق نے کہا! اے رسول آپؐ کہہ دیجئے کہ ''اللہ ایک ہے'' کفار ان مکہ کی سازش تھی کہ داعی حق کو ختم کر دیں یا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے خلاف سازش تھی کہ نقطۂ ہدیٰ کی رفعت کو زک پہونچائیں کا شانۂ نبوت جو مرکز رشد وہدایت ہے اس کے خلاف سازش کی گئی گھیرا ڈالو ڈیرہ ڈالو کا عملی منصوبہ بنا

یا گیا اور چند دولتمند خاندان والوں کے فرزند بر ہنہ تلواریں لئے ہوئے بغیر کسی ممانیت کے گھر کا محاصرہ کرلیا رات تھی دن نہ تھا! اللہ تعالیٰ نے ہجرت کا حکم دیا اور ہجرت کی شب بغیر کسی یار و مددگار کے علی کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا اور کہا کوئی بھی تم کو نقصان نہیں پہونچا سکتا حضور نور مجسم ﷺ کی باتوں کو علی نے تسلیم کیا صبر و استقامت نے رضا بہ رضائے الٰہی قبول کیا جب علی سے رسول مطمئن ہو گئے تو دروازہ کھولا! تو دیکھا کہ کفاران مکہ کا شانہ رسالت کو حصار میں لے چکے ہیں اللہ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈالدیا جب حق ظاہر ہوا تو کافر کو شکست ملی یہاں تک کہ وہ کچھ دیکھ نہیں سکتے گویا ایک طرف کفاروں کا سخت نرغہ تھا تو دوسری طرف رب قدیر کی نگہبانی تھی لیکن مرکز رشد و ہدایت کی بستر پر علی سبز چادر میں لپٹے ہوئے باخبر سوئے تھے کفاران مکہ نے علی کو محمد سمجھا اور طلوع فجر تک قدم جمائے گھر کے چاروں طرف چاک چوبند تھے اور رات کی انتہائی تاریکیوں میں ابوبکر اپنے گھر پر منتظر تھے کہ حضور ﷺ تشریف لائیں تو غار ثور جائیں گویا ہجرت کی ابتدا شب سے ہوئی مگر اعلان نبوت کے چھ سال کے بعد شعب ابی طالب میں تین سال تک سکونت اختیار کی تھی اور ہجرت کے موقع پر حضور تین دن تک غار ثور میں رہے تا کہ علی ابن ابی طالب آقائے نعمت کے حکم کے مطابق جس کی قیمتی امانت تھی اس کو علی دے دیں چنانچہ کئی بار مکہ شریف کی پہاڑیوں پر بے لاگ کھڑے ہو ہو کر آواز لگائی اور اس کے گھر تک اس کی قیمتی امانتیں پہونچا دیں نقطۂ تقدس کا افہام سمجھانا آسان نہیں لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول خوب جانتا ہے بہر حال مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے المرتضیٰ میں یہ لکھا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سازش سے آگاہ کر دیا اور آپؐ نے حضرت علی کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا اور فرمایا ''تم کو کوئی بھی گزند نہیں پہونچائیگا''۔۱۶؎

ہجرت کی شب اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا تو آپ ﷺ بلا کسی خوف وخطر کے اپنے گھر سے نکلے تو اہل بیت رسول اللہ میں صرف علی موجود تھے ان کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا ہجرت کی ظاہری نوعیت قید و بند یا قتل و غارت گری یا شہر بدر پر موقوف تھی اور مکہ کے جاں باز جوانمرد کفر کی ہلاکت وفلاکت پر نازاں تھے یعنی لات وعزیٰ کے پرستار شیطانی منصوبہ پر عمل پیرا تھے مرکز رشد و ہدایت کو اپنے گھیرے میں لیا اور یہاں تک کہ کفاران مکہ کی تاک جھانک نے فیصلہ کرلیا کہ محمد سوئے ہوئے ہیں اگر ہجرت کا حکم نہ ہوتا تو رسول ہجرت نہ کرتے اور مولائے کائنات کفاروں کے نرغے میں نہ سوتے یہ تو بات کہنے کی ہے کہ ایسا ہوتا تو ویسا نہ ہوتا مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا کہ ''اگر ظلم نہ ہوتا تو

ہجرت بھی نہ ہوتی اور اگر ہجرت نہ ہوتی تو وہ تمام نتائج بھی ظہور میں نہ آتے جو ہجرت سے ظہور میں آئے''،لیکن اس کی ازلی حقیقت یہ ہے کہ مولائے کائنات بستر رسول ﷺ پہ آئے تو اس یقین کا مل کے ساتھ آئے کہ رسول نے فرمایا ہے کہ تم کو کوئی گزند نہیں پہونچا ئیگا گویا کاشانۂ نبوت کے باہر کفر کا گھیرا تھا اور کاشانۂ رسالت کے اندر فرشتوں کی نگہبانی تھی تو علی ابن ابی طالب حضور ﷺ کی سبز چادر اوڑھ کر لیٹ گئے اور گہری نیند آئی اور سو گئے تو اللہ تعالیٰ نے سورہ انفال میں ذکر کیا اور اپنی تدبیر سے آگاہ کیا کہ ہجرت کی شب، بستر رسالت اور مولائے کائنات کی فرمانبرداری کی باتوں کا ذکر جمیل مدینہ میں کیا چنانچہ سورہ انفال کی آیت کا ترجمہ فاضل بریلوی امام احمد رضا خاں کا ملاحظہ کیجئے:۔

او اذیمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک و یمکرون و یمکر اللہ و اللہ خیر الما کرینo اور اے محبوب یاد کرو جب کافر تمہارے ساتھ مکر کرتے تھے کہ تمہیں بند کر لیں یا شہید کر دیں یا نکال دیں اور وہ اپنا سا مکر کرتے تھے اور اللہ اپنی خفیہ تدبیر فرما تا تھا اور اللہ کی خفیہ تدبیر سب سے بہتر ہے۔۱۷

عرب کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور کافر و مشرک کے مکر پر غور وفکر کریں تو فریب کش جذبات کے مرحلے باہم سرگرم عمل نظر آئیں گے ان کی حکمت عملی کی سرتابی ذی عقل کی خامی پر موقف تھی عرب کی قوم اساطیر الاولین کی حیثیت سے بڑی ہوشیار تھی ہر طرف کفر وشرک کا شور وغوغا تھا کفاران مکہ عمر و بن لُحّی کے معتقد تھے اس نے دین ابراہیمی کو تبدیل کیا اور پورے جزیرۂ عرب میں بتوں کو نصب کیا اس طرح بت پرستی کا رواج قائم ہو گیا مگر عبد مناف کی اولاد نے دین ابراہیمی کو اختیار کیا اس لئے کہ قصی بن کلاب نے واضح طور پر کہا کہ عزت وتکریم سے جس کی اصلاح نہیں ہوتی ذلت ورسوائی اس کی اصلاح کر دیتی ہے اگر بنی نوع انسان کی عظمت کا اعتراف پس پردہ حرص وطمع پر رکھی گئی ہو اور اس کے عملی منصوبہ پر کافر ومشرک کاربند تھے کذب آرائی نظریے سے مرعوب تھے یعنی ایام جہالت میں امانت وخیانت، کذب وصداقت کا پیمانۂ تصور کا تعین عام تھا تا کہ اس کسوٹی پر حضور ﷺ کی پہچان اور امانت کی شناخت کی جائے صادق وامین کہنے والے کفاران مکہ جب اپنی امانت حوالہ کرتے اور کچھ عرصہ میں طلب کرتے تو قیمتی امانتیں ہو بہو واپس ملجاتیں گو یا جیسا دیتے ویسا واپس لیتے اور ہمہ وقت حق وصداقت کا اعتراف کرتے یعنی کس قدر دلکش قاعدہ کلیہ کا پس پردہ جوہر تھا اور حسن طبع کا مایہ ناز محاسبہ کا انعقاد عمل تھا گویا کافر ومشرک اہم نظریات سے واقف تھے مجموعی طور پر نظر ڈالی جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کافروں مشرکوں نے اخلاق وحکمت کے سرچشمۂ ہدایت کو سمجھا

نہیں لیکن متفرق حالات کے باوجود حقیقی امانت وصداقت سے اپنی انفرادی صورت پیش کی جو دنیا کی تاریخ میں بے مثل نمونۂ حیات ہے مولانا عبدالماجد دریابادی نے تفسیر ماجدی میں ایام جہالت کے نظریے اور مکروفریب کے نقش کو قصہ وکہانی پر مبنی قرار دیا ہے اور قرآن نے ان کی نشانیاں واضح طور پر ایک نقطۂ آہنگ پر مرکوز کیا ہے یعنی قدیم ظرفہائے اصول کا نکتۂ افہام ملاحظہ کیجئے:۔

وہی پرانے قومی افسانے، اکثر منظوم، جن کا دستور یونان، ایران ہندوستان وغیرہ ہر قدیم ملک میں تھا اور جن کے نمونے یونان کے ایلیڈ ایران کے شاہنامہ اور ہندوستان کی مہابھارت میں آج بھی موجود ہیں۔۱۸؎

تفسیر ماجدی کے متن میں قدیم خیالات کے دستور کا نظریہ غالب ہے بلکہ لایعنی توجیہات کی تمثیل آرائی کی داستان کی نشاندہی ہے اور افسانوی اسلوب میں قصہ کی نوعیت بیان کی گئی ہے جو کبر کی انانیّت، غرور کی حکایت اور حوصلہ افزائی کی سند ہے لیکن مکہ کی تاریخ میں قصیٰ بن کلاب کی رہائشی نمونے ملتے ہیں اور اس کی ابتدائی تاریخ کے نوادرات اور آثار کے نقوش ملتے ہیں کہ قصی نے بنی خزاعہ کے سردار حبیٰ بنت حلیل کا رشتہ طلب کیا تو حلیل نے قصی بن کلاب کی شرافت کا احترام کیا اور اپنی بیٹی کا نکاح قصی سے کر دیا آپ کے چار بیٹے ہوئے عبدالدار، عبدمناف، عبدالعزیٰ اور عبد بن قصی ہیں کہا جاتا ہے کہ حلیل عمر دراز ہوا تو کعبہ کی تولیت کے فرائض انجام دینے سے مجبور ہو گیا تو اس نے اپنی بیٹی حبیٰ کو کعبہ کا متولی بنا دیا بیٹی نے کہا! اے میرے شفیق والد بزرگوار میں کعبہ کا دروازہ نہ کھول سکتی ہوں اور نہ بند کر سکتی ہوں تو حلیل نے اپنی تولیت کو محفوظ رکھا اور بیٹی کی بات پر غور وفکر کے بعد فیصلہ کیا اور اپنے بیٹے ابی غُبشان کے حوالہ کر دیا کہ کعبہ کا دروازہ کھولے اور بند کرے لیکن کچھ ہی عرصہ میں قصی بن کلاب نے عرب پر غلبہ حاصل کیا اور اس نے جرأتمندانہ قدم اٹھایا اور ابی غُبشان کے گھر گیا اپنے سالا سے ''شراب کا ایک مشکیزہ اور سارنگی کے عوض ابی غُبشان سے کعبہ کی تولیت کا حق خرید لیا'' خانوادۂ کلاب کا قصیٰ پہلا شخص ہے کہ جس نے عرب میں اپنی حکومت قائم کی اور وادی بطحا کو عزوشرف بخشا اور خودمختار بن بیٹھا تو قصیٰ نے کہا! کہ ''شراب بدن کو درست کرتا ہے مگر ذہن کو برباد کر دیتا ہے''! بہرکیف قصیٰ نے بنی خزاعہ اور بنی بکر کو شہر بدر کیا اور مکہ کے رقبہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور مکہ کے اطراف واکناف میں بسے تمام قریشیوں کو یکجا کیا اور امن وسلامتی کا درس دیا اور دین حنفیہ کے اصولوں سے متنبہ کیا اور والہانہ عشق ومحبت سے تعبیر کیا اور گم شدہ ظاہری وباطنی فضائل وکمالات کی تعلیمات سے آگاہ کیا گویا دین حنفیہ کی کھوئی ہوئی عظمت کو رونما کیا۔

بہر کیف کلاب حضرت آمنہ کے تیسرے دادا تھے اور قصی بن کلاب تک حضور ﷺ کے والد اور والدہ کا نسب نامہ جا ملتا ہے مگر کفار ان مکہ نے کہا! کہ اگر آپ رسول ہیں تو اپنے رب سے دعا کریں کہ ان پہاڑوں کو یہاں سے دور کر دے تا کہ ہم لوگوں کے لئے میدان کشادہ ہو جائے اور تیرا رب شام و عراق کی طرح ہم لوگوں کے لئے دریا جاری کر دے اور ہمارے آباؤ اجداد جو مر چکے ہیں ان کو پھر سے زندہ کر دے مگر ان میں قصی بن کلاب کا زندہ ہونا لازم ہے کیونکہ وہ سیدھا راستہ دیکھا نے والا مرد تھا وہ حق گو اور انصاف پسند تھا کافر و مشرک اپنی جہالت کی لعنت میں گرفتار تھے کہ محمد بن عبداللہ کا شجرۂ نسب قصی بن کلاب سے ملتا ہے یعنی محمد بن عبداللہ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصیٰ بن کلاب سے ہے قصیٰ بن کلاب بنو اسماعیل کا فرد تھا اور دین حنفیہ کا پیروکار تھا جھوٹ اور سچ سے واقف تھا قبیلہ قریش نے قصیٰ کی ہدایتوں کو چھوڑا اور خانوادۂ قصیٰ کے خلاف قدم اٹھایا یہاں تک کہ قبیلۂ قریش عَمرو بن لحی کے معتقد یار اور جاں نثار بن گئے اس طرح عَمرو بن لحی کی باتیں گمراہ کرتی رہیں اور بت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہو گئے جب قریشیوں نے آپ ﷺ کو قتل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو فاطمہ رسول کے پاس روتی ہوئی آئیں اور کہا یہ قریش کے لوگ لات و عزیٰ کی قسمیں کھا کر آپ کو قتل کر دینگے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کا حکم عطا کیا تفسیر ابن کثیر کا متن ملاحظہ کیجئے:۔

جب قریش نے قتل کا ارادہ کر لیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو بلایا اور حکم دیا کہ میرے بستر پر لیٹ جاؤ علیؓ سبز چادر اوڑھ کر لیٹ گئے رسول اللہؐ باہر نکلے لوگ دروازے پر دکھائی دیئے آپ نے ایک مٹھی بھر مٹی لی، ان کی طرف پھینکی، ان کی آنکھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پھر گئیں۔۱۹؎

عرب کی تاریخ میں جب شعب ابی طالب کا محاصرہ عمل میں آیا تو بنو ہاشم کا بچہ بچہ تین سال تک محصور رہا یہاں تک کہ ہشام، مطعم، زہیر، اور ابوالبختری نے مل کر منصور بن عکرمہ بن عامر کا ظالمانہ عہد نامہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اس طرح تین سال کے بعد سنگین محاصرہ سے نجات ملی مگر قصیٰ بن کلاب کی تعمیر کردہ دار الندوہ میں سرداران قریش نے مجلس شوریٰ کی جس میں تین نکات کا عملی منصوبہ پیش کیا گیا جس کی تصدیق نص قرآن سے ثابت ہے کہا جاتا ہے کہ نکتہ سنجوں میں خصوصی طور پر شیخ نجدی (ابلیس) شریک ہوا مگر ابوالاسود ربیعہ بن عَمر والعامری نے کہا شہر بدر کر دینا چاہئے لیکن ابو البختری نے کہا کہ اس کو قید با مشقت کر دینا چاہیئے تا کہ وہ قید و بند کی صورت میں ہلاک ہو جائے جیسا کہ زہیر اور نابغہ شاعروں کو اس سے پہلے قید کر دیا گیا تھا اور دونوں تا دم مرگ مقید رہے اور سڑ گل گئے

یہ بھی تو ایک شاعر ہی ہے آخر میں ابوجہل نے کہا ہر قبیلہ سے ایک ایک نوجوان کا انتخاب کرلو! جو بہادر ہو، اعلیٰ نسب ہو اس طرح ہم سب مل کر ایک دفع حملہ کریں تا کہ کسی پر قتل کا لزام عائد نہ ہو سکے اور بنو ہاشم مقتول کے قصاص کی دِیَت مفقود ہو جائے۔

عرب کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قومی زندگی میں شعر و ادب کا مذاق کس قدر صاف و ستھرا تھا اگر معیار پست ہوگا تو ادب کا معیار بلند نہ ہوگا عرب میں شعر و ادب کی نکتہ چینی کے تحقیقاتی اسلوب کا معیار منطقی استدلال پر تسلیم کا جاتا تھا حالانکہ ان کی انانیت نے شاعروں کو درگزر نہیں کیا بلکہ ان کی سخت گیری نے قید کر دیا لیکن ابی طالب نے محمد کی شخصیت کو موضوع بنایا ان کی قصیدہ نگاری سے عقیدت کا پتہ چلتا ہے بہر کیف اسلام میں نعتیہ و حمدیہ شاعری کی اہمیت و افادیت ہے ابی طالب کو علم و ادب کا بڑا دقیق مطالعہ تھا پیرانہ سالی میں اپنے جب بیگانے ہو گئے روز بروز دشمنی اور عداوت میں اضافہ ہونے لگا اور حضور ﷺ کے قریبی رشتہ دار مخالف ہو گئے تو ابی طالب نے ایک قصیدہ لکھا اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف کی اور خصائل حمیدہ کو نمایاں کیا اور کفر و شرک کی اجتماعی ایلغار کو للکارا تو دوسری طرف بنو ہاشم، بنو مطّلب کے نوجوانوں کو متحد ہونے کا پر جوش لب و لہجہ میں اعلان کیا کہ میرا بھتیجا نہایت حسین و جمیل ہے وہ بے مثل گوری رنگت والا ہے جس کے چہرۂ انور سے بارش طلب کی جاتی ہے وہ یتیموں، غریبوں، بے کسوں کا ماوا و ملجا ہے اور بیواؤں کا محافظ ہے بلکہ اتحادی ہدایت کرتے ہیں، تعریف و توصیف میں کما حقہ احتیاط سے کام لیتے ہیں بلکہ قصیدۂ رسالت مآب ﷺ کے الفاظ میں سادگی و اختصار کا فن غالب ہے کہتے ہیں کہ وہ مرد حق ہے! اس کا کوئی مثل نہیں گویا اہل علم کو کفر کی سخت گیری نے دیانت داری کا راستہ دکھایا آخر کار حق شناس نے پردۂ حقائق سے آشنا کیا اور حکمت و معرفت، تزکیہ نفس، اور تطہیر قلب کا مژدہ سنایا اور آغوش محمد کی برکت و رفعت سے آگاہ کیا اس طرح ابو طالب نے اپنے ارادہ کو عملی جامہ سے مرصّع کیا اور اپنے فکر و فن سے عرب کے قبائل کو آگاہ کیا کہ محمد کی پناہ میں آل ہاشم کے مفلس آتے ہیں اور ان پر اپنے رحم و کرم کی بارش برسا دیتا ہے ابی طالب کے انتقال کے بعد حالات سنگین سے سنگین ہوتے چلے گئے تو حضور ﷺ نے کہا! اے چچا! کتنی جلدی میں تیرے کھو جانے کو محسوس کرنے لگا ہوں! چنانچہ سب نے مل کر حضور ﷺ کی مخالفت میں سخت قدم اٹھایا اور کافر و مشرک قاتل بن کر یکجا ہو گئے تو فاطمہ بنت رسول رونے لگیں تو حضور ﷺ نے فرمایا اے میری پیاری بچی! مت رو! بے شک اللہ تعالیٰ تیرے باپ کا نگہبان ہے تو جبرئیل آئے اور کہا کہ آج کی رات بستر پر نہ سونا اور کافروں کی سازش کی اطلاع دی اور ہجرت کا حکم

دیا چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں یہ مذکور ہے ملاحظہ کیجئے:۔
مشرکین حضرتؐ کے گھر کی چوکیداری کرتے رہے علیؓ کو محمد سمجھتے رہے صبح کے قریب دھاوا بول دیا لیکن گھر میں علی کو دیکھا تو سارا منصوبہ چوپٹ ہو گیا پوچھنے لگے محمدؐ کہاں ہیں علیؓ نے کہا مجھے کوئی خبر نہیں۔۲۰؎

چنانچہ مولائے کائنات بستر رسول سے اٹھے اور رسول کے حکم کے مطابق جن لوگوں سے آپؐ کے تجارت کا سامان گھر میں لین دین کا محفوظ تھا علی نے غور وفکر کیا اور ان تمام تصفیہ طلب امور کو سمجھا اور مسائل کے معاملات کو بخوبی حل کیا اور جس کا جس کا جو سامان تھا بعض تو لے گئے اور بعضوں کو گھر تک پہونچایا اس طرح معاملات سے بری الذمّہ ہوئے گویا تین دن تک قیمتی امانتیں جس کی تھیں حضور ﷺ کی ہدایت کے مطابق واپس کیا کہا جاتا ہے کہ مولا نے حسن وخوبی کے ساتھ جس کی امانتیں تھیں اس کو دیدیا تو مطمئن ہوئے اور تیسرے دن مکہ سے روانہ ہوئے اور قبا میں پہونچے! مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے المرتضی میں یہ لکھا ہے ملاحظہ کیجئے:۔
حضرت علی راتوں کو چلا کرتے اور دن کو کہیں چھپ رہتے اس طرح مدینہ پہنچے آپ کے پاؤں پھٹ پھٹ گئے تھے رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا علیؓ کو بلاؤ لوگوں نے عرض کیا وہ چل نہیں سکتے آپؐ خود ان کے پاس تشریف لے گئے گلے سے لگایا اور ان کے پیر ورم کو دیکھ کر رو پڑے، پھر ان پر لُعاب دہن لگایا اور دست مبارک ان کے پیروں پر پھیرا ۔۲۱؎

حضرت علی ابن ابی طالب مکہ سے مدینہ کے قریب ایک چھوٹی بستی میں پہونچے تو معلوم ہوا کہ قبیلہ عَمرو بن عوف کا سردار کلثوم بن ہدام کے گھر پر حضور ﷺ تشریف فرما ہیں تو مولائے کائنات کے متعلق حضور ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ نے بلایا مگر پیر ورم کر گئے تھے! چلنے کی سکت نہ تھی! پاؤں میں آبلے پڑ گئے تھے! جہاں بیٹھے تھے! اب اٹھنے بیٹھنے کی صلاحیت نہ تھی! تو خود حضور ﷺ قبا میں پہونچے! علی کو دیکھا رو پڑے، گلے لگایا، آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے اور اپنے ہاتھوں میں اپنا لعاب دہن ڈالا اور علی کے پاؤں پر اپنے ہاتھوں کو پھیرا جس کی برکت سے اللہ تبارک تعالیٰ نے اچھا کر دیا چلنے پھرنے کے لائق بن گئے اچانک خوشی کی انتہا نہ رہی، تھکا ماندہ صعوبتوں کا انبار، مکہ کا رنج وغم رفع دفع ہو گیا اور علیؓ حضور ﷺ کے ساتھ کلثوم بن ہدام کے گھر ساتھ آئے جہاں حضور ﷺ مہمان تھے چنانچہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے سب سے پہلے اسلامی رشتہ اخوت کو رونما کیا اور اسلامی بھائی چارہ کی برکت سے روشناس کیا تمام مہاجرین وانصار کو جمع کیا اور حضرت علیؓ کو اپنا بھائی کہا۔ بہر کیف

سیرۃ الرسول جلد دوم کے مصنف پیر محمد کرم شاہ الازہری نے یہ لکھا ہے اس کا متن ملاحظہ کیجئے:۔
نبی کریم نے فرمایا دو دو آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ سرکار دو عالم نے سیدنا علی ابن ابی طالب کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا یہ میرا بھائی ہے۔ ۲۲؎

حضور ﷺ نے مہاجر و انصار میں بھائی چارہ کو قائم کیا تا کہ ایک دوسرے کا خیال کریں اور آپس میں مل جل کر اپنی زندگی بسر کریں ہجرت کی ابتدا کب ہوئی آخر اس کی انتہا کب ہے اسلام کی تاریخ میں دینی معاشرہ کی بڑی معنویت وافادیت ہے اگر ہجرت کی ابتدا شب کی انتہائی تاریک میں رکھی گئی ہے تو اسلام کی فتح ونصرت کی ابتدا طلوع فجر پر پر ہوگی گر سفر کا آغاز مکہ کی زمین سے ہے تو اس کا انجام بھی اسی جگہ سے وابستہ ہے گر صبر وتحمل ہے تو آغاز کا انجام یقینا برآمد ہوگا یہ تو ایک اصول و ضابطہ ہے کہ آغاز کے پس پردہ انجام کا پہلو رونما ہوتا ہے گویا تکوینی کی ابتدا کی تمہید ہے تو اس کی انتہا بھی ہوگی جس سے آئینۂ حیات کی ظاہری صورت کی تعمیر ہوتی ہے کفار ان مکہ کا جبر واستبداد، ظلم وستم کا شیطانی وسوسہ اور مشرکانہ عقائد کو یقینا پارہ پارہ کر دے گا! آخر کار حضور ﷺ نے غار ثور کو خیر آباد کہا! اور یکم ربیع الاول کی انتہائی شب میں رفیق غار کے ساتھ اپنی ہجرت کی ابتدا کی اور دشوار مرحلوں سے گزرتے ہوئے ۱۲ ربیع الاول کو قبا پہونچے تو دو ہفتہ اقامت گزیں رہے اللہ کی عبادت کے لئے مسجد قبا کی بنیاد تقویٰ پر رکھی اور اسلامی رشتۂ اخوت کی تعلیم وتربیت کی بنیاد قائم کی اور معبود الٰہی کی حقیقی تنقیح کی توضیحی تفسیر کی تعمیر کے لئے عملی منصوبہ بنایا گیا اور اسلام کی پہلی حقیقی مسجد قبا کی اصلیت بیان کی گئی جس میں تقویٰ شعاری اور اللہ کی عبادت تھی تو مدینۃ النبی معبود حقیقی کی تمجیدی وصف کی آماجگاہ بن گئی جس کے دائرے میں بھائی چارہ کی نوعیت بیان کی گئی یقینا توفیق الٰہی کا آغاز آپ کی ہجرت سے ہے اگر انصار ومہاجر دو ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ دو دو ایک ہو جاؤ یعنی رشتۂ اخوت کو نمایاں کیا بہر کیف حضور ﷺ مسجد نبوی کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اپنی ازواج مطہرات کے لئے نو حجروں کی تعمیر حسب ضرورت تکمیل کی گئی لیکن آپؐ نے اہل بیت کو مکہ سے لانے کے لئے حضرت زید اور ابو رافع کو دو اونٹ اور پانچ سو درہم زاد سفر کا دیکر بھیجا چنانچہ سیرۃ الرسول جلد سوم کے مصنف پیر محمد کرم شاہ الازہری نے یہ لکھا ہے اس کا متن ملاحظہ کیجئے:۔

مدینہ طیبہ میں چند روز قیام پذیر رہنے کے بعد رحمت عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیت کو مکہ سے لانے کے لئے حضرت زید بن حارث اور حضرت ابو رافع کو مکہ بھیجا حضور نے انہیں دو اونٹ سواری کے لئے اور پانچ سو درہم بطور زاد سفر عطا فرمائے۔ حضرت ابو بکر صدیق نے عبداللہ بن

اریقط کو جو سفر ہجرت میں قافلہ کا دلیل راہ تھا دو اونٹ دے کر حضرت زید اور ابو رافع کی معیت میں بھیجا۔ ۲۳؎

حضور ﷺ کے حکم کے مطابق حضرت زید اور ابو رافع مکہ گئے اور مکہ سے خانوادۂ نبوت اور خاندان رفیق غار کے افراد بخیر و خوبی مدینہ پہنچ گئے کہا جاتا ہے کہ اس سفر میں حضور ﷺ کی دو بیٹیاں (کلثوم اور فاطمہ) اور دو بیویاں (سودہ اور عائشہ) اور رفیق غار کی ماں (ام الخیر) اور بیوی (ام رومان) تھیں اس کے علاوہ حضور کی دائی ام ایمن جو حضرت زید کی بیوی تھیں اور بیٹا اسامہ تھا اور سب کے ہمراہ عبداللہ بن ابو بکر بھی ہجرت کر کے آئے لیکن سب کے سب ابو بکر کے یہاں کچھ دنوں تک رہے علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ رسالت مآب ﷺ نے مسجد نبوی کے ارگرد اپنے اہل و عیال کے لئے حجرات تعمیر کئے تو سب سے پہلے ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ تشریف لائیں چونکہ حضرت ام المومنین خدیجہ بنت خویلد کی وفات کے بعد مکہ میں حضور ﷺ نے اپنی زوجیت کا شرف عطا کیا تھا اور حضرت عائشہ صدیقہ سے نکاح کیا تھا جب کہ آپ کی عمر چھ سال تھی اس طرح مکہ سے ہجرت کر کے اہل بیت اور خانودۂ ابو بکر مدینہ بخیر و خوبی پہونچ گیا چنانچہ سیرۃ الرسول جلد سوم کے مصنف پیر محمد کرم شاہ الازہری نے یہ لکھا ہے اس کا متن ملاحظہ کیجئے:۔

چنانچہ حضرت زید اور ابو رافع سیدہ فاطمۃ الزہراء سیدہ امّ کلثوم حضور پر نور کی دونوں صاحبزادیاں ام المومنین حضرت سودہ، حضور کی دائی ام ایمن، جو حضرت زید کی زوجہ تھیں اور ان کے بیٹے اسامہ کو لے کر بخیریت واپس پہنچ گئے ان کے ہمراہ عبداللہ بن ابی بکر، اپنی والدہ ماجدہ ام رومان حضرت صدیق کی والدہ اور آپ کے دو صاحبزادیاں، حضرت عائشہ حضرت آسماء رضی اللہ عنہم اجمعین کو لے کر پہنچ گئے۔ ۲۴؎

حضور ﷺ کے حکم کے مطابق زید بن حارث اور ابو رافع مکہ سے مدینہ خانوادۂ نبوت اور خاندان رفیق غار بخیر و خوبی ابو بکر کے گھر پہونچا تو کچھ دنوں تک اقامت گزیں رہا جیسے ہی حجرہ تیار ہو گیا تو ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ تشریف لے گئیں اس طرح کچھ عرصہ میں خانوادۂ نبوت مسجد نبوی کے ارد گرد بنے ہوئے حجروں میں منتقل ہو گیا اور ہجرت کے پہلے سال ماہ شوال ا ہجری میں عائشہ کی رخصتی ہوئی لیکن اسی سال فاطمہ بنت رسول کا نکاح حضرت علی ابن ابی طالب سے ہوا بہر کیف ہجرت کے پہلے سال جو واقعات رونما ہوئے اس کا ذکر سیرۃ الرسول جلد سوم کے مصنف پیر محمد کرم شاہ الازہری نے کیا ہے اس کا متن ملاحظہ کیجئے:۔

ہجرت کے پہلے سال جو واقعات رو پذیر ہوئے ان میں سے اہم ترین واقعہ سیدہ عائشہ صدیقہ کی رخصتی ہے ہجرت سے پہلے ماہ شوال میں حضرت عائشہ کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نکاح پڑھا گیا تھا لیکن رخصتی ہجرت کے ساتھ ماہ بعد شوال میں ہوئی۔ ۲۵؎

پیر محمد کرم شاہ الازہری نے سیرۃ الرسول جلد سوم میں حافظ ابن حجر کے قول کو نقل کیا ہے کہ فاطمہ بنت رسول کا نکاح ماہ رجب میں ہوا آپ ﷺ نے خود نکاح پڑھایا لیکن رخصتی غزوۃ بدر کے بعد ہوئی مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ نکاح کے تقریباً دس گیارہ ماہ بعد باقاعدہ رخصتی ہوئی اس عرصہ میں حضرت علی مسجد نبوی میں اور رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے جب رخصتی ہوئی تو دونوں میاں بیوی پر وضو کا پانی چھڑکا اور خیر و عافیت کی دعا دی چنانچہ سیرۃ الرسول جلد سوم کے مصنف پیر محمد کرم شاہ الازہری نے حافظ ابن حجر کے قول کو بیان کیا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

نکاح ماہ رجب ۱ ہجری میں ہوا اور رخصتی غزوۃ بدر کے بعد ۲ ہجری میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر مبارک اٹھارہ سال تھی۔ ۲۶؎

بہر کیف حضرت فاطمہ بنت رسول کا نکاح ۱ ہجری میں ہوا تثلیث فاطمہ کا آخری مرحلہ نقطۂ عروج کا شاہکار کرشمہ ثابت ہوا جس کے اردگرد عرب کی تاریخ کے رمز و اشارے فقر و افاقہ، صبر و قناعت، جود و سخا، یتیم و اسیر اور تسلیم و رضا سب کے سب اسلام کے دائرے میں یکجا جمع ہوئے اور اپنی سلامتی و تحفظ کی بقا چاہتے تھے ادب اور معاشرہ میں اپنی پہچان اپنی شناخت اور اپنی حقیقت کی تلاش میں مرکب الفاظ سربکف عمل تھے گویا غربت کے دامن میں یکے بادیگرے کوشاں تھے اور کاشانۂ نبوت کا گوہر صدف، خانوادۂ بنو ہاشم کا آخری طرۂ امتیاز، نجیب الطرفین کا دور رس نکتہ رُ تفع، حقائق و معارف کا سالار ''انا مدینۃ العلم وعلی بابھا'' کا علمبردار جس کی نجابت و شرافت کی شہادت اعلان نبوت سے پہلے ملی تھی گویا علی کی پرورش آغوش رسول میں ہوئی تھی اور دینی تعلیم و تربیت امام الانبیاء نے کی آپ کے فضائل و کمالات بے شمار ہیں علی جب کمسن تھے تو محمدؐ نے اپنی کفالت میں لے لیا ابو طالب کی شخصیت اللہ و رسول کے درمیان اور کفار ان مکہ کے سرداروں کے نزدیک معتبر تھی والد کے عہد و پیمان میں بڑی تخلیقی صلاحیتیں تھیں جب تک زندہ رہے تو دہلیز ابو طالب پر قوت فاسدہ کا عروج و زوال بھی سربہ نگوں تھا تو اسلاف سے دین حنفیہ کی حقیقت پسندی ملی تھی اسی بناء پر آئینہ صداقت کی روش نے حق شناسی سے انہماک پیدا کر دیا تھا تو دوسری طرف ابی طالب کے چھوٹے بیٹے حضرت علی کو اعلان نبوت سے پہلے ہی آغوش رسول میں پہنچا دیا تا کہ خدیجۃ الکبریٰ کی عظمت میں پرورش پا کر منصب

رسالت ونبوت کے گرد رہ کر خانوادۂ نبوت کے تمام علوم وفنون کا مرکز ومحور تصور کیا جائے آخر کار غزوۂ بدر کے بعد ماہ شوال میں حضرت فاطمہ بنت رسول کی رخصتی ہوئی تو حارثہ بن نعمان کے کرایہ کے مکان میں انتہائی خوشی سے تشریف لائیں اور اللہ تبارک تعالیٰ نے ۳ ہجری میں آپ کے بطن پاک سے ایک مولود مسعود معصوم عطا کیا چنانچہ پیر محمد کرم شاہ الازہری نے سیرۃ الرسول جلد سوم میں یہ لکھا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

پندرہ رمضان المبارک ۳ ہجری میں اللہ تعالیٰ نے حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کو حضرت سیدۃ نساء العالمین البتول الزہراء رضی اللہ عنہا کے بطن پاک سے ایک مولود مسعود عطا فرمایا ان کی ظاہری صورت اور باطنی سیرت مظہر جمال وکمال محمد مصطفیٰ تھی علیہ وعلی آلہ واصحابہ الطیب التحیۃ والثنا۔ ۲۷

حضرت امام حسنؓ ابن علیؓ کی تاریخ پیدائش ۱۵ رمضان المبارک ۲ھ کو ہوئی تو سرور کائنات نے ساتویں دن دو دنبے کا عقیقہ ذبح کیا اور سر کا بال منڈوایا اور بال کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کیا اور فاطمہ بنت رسول نے دائی کو دنبے کی ایک ران اور ایک درہم عطا فرمایا اور اسی روز ختنہ بھی کیا گیا اور نام تجویز کیا گیا لیکن رب العالمین نے جبرئیل کو بھیجا تو کہا ہارون کے بیٹے کا جو نام تھا وہ رکھیں پوچھا کیا نام تھا تو بتایا کہ ''شبر'' تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ میری زبان عربی ہے تو جبرئیل نے کہا ان کا نام حسن رکھئے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے صاحبزادے کا نام رسول کی زبان سے تجویز فرمایا تو دوسرے صاحبزادے کی ولادت ۴ ہجری میں ہوئی چنانچہ پیر محمد کرم شاہ الازہری نیسیرۃ الرسول جلد سوم میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اس کی عبارت ملاحظہ کیجئے:۔

۵ شعبان المعظم ۴ ہجری کو دوسرا فرزند ارجمند ارزانی فرمایا نبی مکرم کو اس فرزند کی ولادت کا مژدہ سنایا گیا تو حضور کو انتہائی مسرت حاصل ہوئی گھر تشریف لائے بچے کو اپنی گود میں لیا کھجور کا ایک دانہ منہ میں ڈال کر چبایا اسے گداز کیا اور بطور گھٹی اس مولود مسعود کے منہ میں ڈالا۔ ۲۸

حضرت امام حسینؓ ابن علیؓ کی تاریخ پیدائش ۵ شعبان المکرم ۳ھ ہے جب حضور ﷺ کو فرزند کی ولادت کا مژدہ سنایا گیا تو انتہائی مسرت ہوئی گھر پر تشریف لائے اور اپنی گود میں لیا اور کھجور کا دانہ چبایا ہوا لعاب دہن کے ساتھ مولود مسعود کے منہ میں ڈالا ساتویں دن عقیقہ کیا اور سر منڈائے گئے اور بالوں کے برابر چاندی صدقہ کیا اور نام تجویز کیا تو حسین رکھا آپ کی کنیت ابوعبداللہ اور لقب سبط رسول اللہ اور ریحانۃ الرسول ہے حضور ﷺ کو دونوں شہزادوں سے بے حد محبت تھی لیکن اسی سال حضرت علی کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بنت اسد کا انتقال ہوا یہ پہلی ہاشمی خاتون ہیں

جن کے بطن سے ہاشمی بچہ پیدا ہوا بہر حال سیرۃ الرسول جلد سوم کے مصنف پیر محمد کرم شاہ الازہری نے یہ لکھا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جد کریم حضرت عبد المطلب کی وفات کے بعد حضرت ابو طالب کی آغوش تربیت میں آ گئے تھے تو حضرت فاطمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سگی ماں کی طرح محبت کرتی تھیں جب ان کا انتقال ہوا تو حضور نے اپنی قمیص اتار کر انہیں پہنائی اور ان کی لحد میں کچھ دیر کے لئے خود لیٹے رہے جب ان کو دفن کر چکے تو فرمایا ''اے میری ماں! اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر دے بیشک تو بہتر ماں تھی۔۲۹؎

بہر کیف سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ انتقال کر گئیں تو ناگہاں اپنے دادا عبد المطلب کی آغوش عاطفت میں آ گئے محض دو سال کا عرصہ گزرا کہ آپ کا انتقال ہو گیا لیکن حقائق و معارف کے انوار مکہ و مدینہ کے ریگزاروں، ریگستانوں میں ہمہ وقت اشارتاً و کنایتاً ظاہر ہوتے رہے گر تاریخی نو درات کا دیکھنا مقصود ہے تو کوئی مضائقہ نہیں بس دھیان و گیان کی ضرورت ہے کہ عربوں کی جہالت کی عائلی فصیل کی دیواریں منہدم کر دی جائیں اور عامۃ الناس کے لئے ایک اصول وضع کئے جائیں تا کہ اپنی عبودیّت کا منشا ظاہر کیا جا سکے چنانچہ اعلان عام ہوا کہ انصار و مہاجر میں کوئی فرق نہیں یعنی مدینہ میں علی کا ہاتھ پکڑا تو کہا! کہ میرا بھائی ہے اگر تم رشتہ طلب کرتے ہو تو سنو! کہ علی بنو ہاشم کے پوشتوں کا نمائندہ ہے گویا تثلیث فاطمہ کی آخری کڑی ہے اس کے ارگرد اسلام کی تاریخ مدنی افق پر طالع و تاباں ہے گویا ظاہری و باطنی حقائق و معارف کے نظریے زہرہ کے محور پر مرکوز ہے یعنی فاطمہ کا لقب زہرہ ہے جو بنت رسول اللہ ہیں۔

بہر کیف تثلیث فاطمہ کے پردے میں حقائق و معارف کے آثار و قرائین کی داستاں مدینہ میں گوشہ گیر تھا اگر محتسب تسبیح کے دانہ کے بجائے دانش کدہ میں دائرۃ المعارف کے نکتۂ اسلام کو اجاگر کرے تو اس کی دانشمندی ہوگی چونکہ اسلام کی تاریخی نوادرات اسقدر واضح طور پر وضع کئے گئے ہیں کہ عرب کے لق و دق صحرائے صحن میں گم شدہ نظریات کے محاسن و معائب نقش کالحجر ہیں تثلیث فاطمہ کی پہلی کڑی شیبہ کی شادی سے شروع ہوتی ہے گویا عبد المطلب نے فاطمہ بنت عَمرو بن عائذ سے شادی کی تو دولڑکے پیدا ہوئے اول ابو طالب اور دوم عبد اللہ تھے دونوں سگے بھائی تھے ایک ہی ماں کی پیٹ سے پیدا ہوئے اور عبد اللہ معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کی شادی قریش کے معزز خاندان میں آمنہ بنت وہب سے ہوئی اور حضرت ابی طالب کی شادی ہاشمی خاتون محترمہ حضرت

فاطمہ بنت اسد سے ہوئی جن کے بطن سے علی پیدا ہوئے۔ گویا دوسری کڑی حضرت فاطمہ بنت اسد ہیں جن کی شفقت ومحبت میں حضور نور مجسم کی نگہداشت ہوئی اور دادا نے اپنے بیٹے ابوطالب کو وصیت کی کہ محمد بن عبداللہ کو تمہارے سپرد کر رہا ہوں اس لئے کہ عبداللہ اور تم فاطمہ بنت عَمرو بن عائذ کے بطن سے ہوئے گویا دونوں سگے بھائی ہوئے اس لئے غور سے سنو! کہ محمد بن عبداللہ کی نہ ماں ہیں اور نہ باپ! اور محمد عبداللہ کی نشانی ہیں اس لئے ابوطالب نے ذمہ دارانہ طور پر عہد و پیمان کا درس لیا اور عمر بھر نبھایا لیکن حضرت فاطمہ بنت اسد کو آخری لڑکا پیدا ہوا تو بلایا! اور کہا میرا لڑکا جو پیدا ہوا ہے وہ کھاتا نہیں ذرا دیکھو کس قدر حسین وجمیل ہے کس قدر نرم ونازک، کس قدر صاف وشفّاف اور لطیف ہے اس طرح حضرت علی اور آغوش رسول میں آئے تو حضور ﷺ نے اپنا لعاب دہن بچہ کے منہ میں ڈالا تو بچہ چوسنے لگا اور چوستے چوستے سو گیا تو حضور ﷺ نے ماں کی گود میں دے دیا اور نام علی رکھا۔ بہر حال مکہ میں فاطمہ بنت اسد اسلام قبول کر چکی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے مدینہ چلی آئی تھیں اور چار ہجری میں جب ان کا انتقال ہوا تو حضور ﷺ نے حیرت انگیز ماحول کا انکشاف کیا کہ فاطمہ بنت اسد کو اپنی قمیص اتار کر پہنائی اور ان کی لحد میں کچھ دیر کے لئے خود لیٹے رہے جب ان کو دفن کر چکے تو فرمایا ''اے میری ماں! اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر دے بیشک تو بہتر ماں تھی!

لیکن یکم جنوری ۶۳۰ء مطابق ۱۰ رمضان المبارک ۸ھ بروز جمعہ عصر کی نماز کے بعد مدینہ سے باہر تشریف لائے اور فتح مکہ کے لئے روانہ ہو گئے اچانک مقام جحفہ پر آپ ﷺ کی ملاقات چچا حضرت عباس سے ہوئی جو ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ جا رہے تھے گویا چچا عباس ہجرت کے ارادہ سے نکلے تھے کہ سارا سامان مدینہ بھیج دیا اور خود حضور ﷺ کے ساتھ سفر میں شریک ہو گئے ۱۱ جنوری ۶۳۰ء مطابق ۲۰ رمضان المبارک ۸ھ بروز دوشنبہ حرم کعبہ میں نزول اجلال ہوا تو نعرۂ تکبیر سے فتح وظفر کے پرچم بلند ہوا زبان حق کے ترجماں نے کہا ''حق آ گیا باطل مٹ گیا بیشک باطل تھا مٹنے والا'' چنانچہ عفو و درگزر، جود و کرم کا بے مثل نمونہ پیش کیا تو چچا عباس سے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا! چنانچہ سیرۃ الرسول جلد چہارم کے مصنف پیر محمد کرم شاہ الازہری نے نقل کیا ہے اس کا متن ملاحظہ کیجئے:۔

اے میرے چچا! آپ جہاں ہیں وہیں ٹھہرے رہیں کیونکہ آپ کی ہجرت کے ساتھ سلسلۂ ہجرت اختتام پذیر ہوگا جس طرح میری آمد نے نبوت کے سلسلہ کو ختم فرمایا۔ ۳۰

گویا حضور ﷺ نے واضح کر دیا کہ چچا عباس کی ہجرت نے ہجرت کا اختتام کر دیا یعنی

ہجرت کی ابتدا سرور کائنات سے شروع ہوئی اور اختتام بنو ہاشم کے خاندان نے کیا سنہ ۸ ہجری میں مکہ فتح ہوا تو وحدہ لاشریک کی آواز کعبۃ الحرم میں گونج اٹھی اور ہر طرف سے قبول حق کا جذبہ ابھر گیا چنانچہ سنہ ۹ ہجری میں وفود کا سلسلہ دور دراز علاقوں سے بارگاہ رسالت میں حاضر خدمت ہوا مگر قول و اقرار کی آماجگاہ میں دیرآئند درست آئند کے محاورے نے اشتباہ پیدا کر دیا شکوک وشبہات اور وہم و گمان نے عیسائیوں کو طاغوتی عمل پر آمادہ کیا تو متفقہ طور پر رومی مملکت میں یسوع کی الوہیت کو ۳۲۵ء میں تسلیم کر لیا گیا گویا عیسائیوں کی تثلیث کے عقیدہ کو صحیح مان لیا گیا اور مریم کی ممتا کو یکسر کالعدم قرار دے دیا گیا اور اس کی کرامت کی اولین نظامت نے مجسمہ کی حسین پیکر تراشی کی اور سر کاری طور پر بیٹے کی الوہیت کا مظہر تعین کیا گیا جس سے خدا مسیح کی صورت میں جلوہ گر ہوا چنانچہ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو نے لکھا ہے کہ قریشی قبیلہ جو بنو اسماعیل کا خانوادہ تھا نجران میں جا کر آباد ہوا تھا بہر نوع نجران کے حواشی کا متن ملاحظہ کیجئے:۔

احقاف اور عسیر کے مابین ایک آبادی تھی جہاں بجیلہ بن لزار اسمٰعیلی کا قبیلہ آباد تھا اور اسلام سے کچھ زمانہ قبل نجران میں عیسائیت پھیل گئی تھی چنانچہ ۹ھ میں عیسائیوں کا ایک وفد نبی کریم کے حضور میں آیا تھا۔۳۱؎

بہر کیف ہجرت کے نویں سال سب سے پہلے نجران کے وفد کو حاضری کا شرف حاصل ہوا حالانکہ فتح مکہ کے موقع پر کعبہ شریف میں بتوں کا انبار تھا ہر قبیلہ کا خدا الگ الگ ناموں سے وابستہ تھا اس کے خلاف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آواز بلند کی مگر نجران کے عیسائیوں کا عقیدہ آبائی نظریے پر مختص تھا یعنی مسیحی مذہب کے مطابق خدا کی وحدانیت کی شاخیں تھیں باپ، بیٹا، اور روح القدس یعنی تین حصوں میں تقسیم کرنا تھا یعنی مذہبی نظریات کی بنیاد ''عقیدۂ تثلیث'' پر ثبت تھا باپ سے مراد الٰہ تھا اور بیٹا سے مراد ابن مریم تو روح القدس سے جبرئیل تسلیم کر لیا گیا تھا مگر قریشیوں کے یہاں حیلہ وحوالہ کی گنجائش نہ تھی بلکہ لات وہبل کی خدائی تھی کہ داعی اسلام نے دعوت توحید کی دلنشیں، وحدانیت کی صدا کا اعلان کوہ صفا کی چوٹی سے کیا تو کفر وشرک کی انتہائی کوشش تھی کہ عقیدۂ توحید کو ختم کر دیا جائے مگر اکیس سال کے بعد قریشیوں نے نبوت کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا۔ حق تو یہ ہے کہ حق آیا اور باطل ہلاک ہوا۔

چنانچہ مدینۃ النبی میں عیسائیوں کا وفد بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا تو کہا المسیح ابن اللہ ''مسیح اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے'' اور دوسرے نے کہا کہ مسیح خدا ہے تو پیغمبر اسلام نے یہ اعلان کیا کہ ''ھو عبداللہ و کلمتہ القٰھا الیٰ مریم'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں مسیح بن مریم نے بنی اسرائیل سے کہا

تھا کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی جو ہمارا اور تمہارا رب ہے وہی سب کا خالق ہے اور سارے جہان کا رب ہے مگر نجران کے عیسائیوں نے عقیدۂ تثلیث کا تتبع کیا اور اپنی جہالت پر حجت قائم کیا گویا صریحاً وحدہ لاشریک پر بہتان لگایا تو حضور ﷺ سے فرمایا کہ آؤ میرے ساتھ مباہلہ کرو! تو نجرانیوں نے بڑی عاجزی سے ایک روز کی مہلت طلب کی تا کہ خلوت میں باہم مشورہ کر سکیں آپ ﷺ نے اجازت دے دی تو دوسرے روز حضور ﷺ تشریف لائے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو حکم دیا قرآن کی آیت مباہلہ ملاحظہ کیجئے:۔

فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآئَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآئَنَا وَ أَبْنَآئَکُمْ وَنِسَآئَنَا وَ نِسَآئَکُمْ وَ أَنْفُسَنَا وَ أَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْکٰذِبِیْنَ 0 ترجمہ پھر اے محبوب جو تم سے عیسیٰ کے بارے میں حجت کریں بعد اس کے کہ تمہیں علم آ چکا تو ان سے فرما دو آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جانیں اور تمہاری جانیں پھر مباہلہ کریں تو جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ڈالیں۔ ۳۲

بہر کیف سورہ آل عمران کی آیت کا ترجمہ فاضل بریلوی امام احمد رضا خاں نے کی ہے نہایت سہل اور سادہ اسلوب میں ہے اسلوب کے آہنگ میں نہ مباحثہ تھا اور نہ مبادلہ کا ذکر تھا جو الفاظ کی وضع داری تھی اس کی ابتدائی اصول کی ماہیئت حقیقت پر مبنی تھی ظاہری طور پر مباہلہ عذاب الٰہی کی دعوت تھی یعنی ایک دوسرے کے حق میں بد عا کریں تو دوسری طرف اعلان عام تھا اور انصار و مہاجر نے کلام الٰہی کو سنا! کہ اہل بیت رسول اللہ کی پہچان تھی چنانچہ تفسیر سید محمد نعیم الدین مراد آبادی نے کی ہے کہ جب نجرانیوں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کے گود میں تو امام حسین ہیں اور دست مبارک میں حسن کا ہاتھ اور فاطمہ اور علی حضور ﷺ کے پیچھے ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنھم اور حضورؐ ان سب سے کہہ رہے ہیں کہ جب دعا کروں تو تم سب آمین کہنا کس قدر واضح اسلوب اور دل نشیں آہنگ ہے کہ موضوع کی ابتدا اور انتہا وحدانیت کی بنیادی شرط تھی جب دوسرے دن نجرانی خلوت سے باہر آئے تو اپنی ہلاکت و فلاکت کو کما حقہ دیکھا تو انکار کر دیا تو ترجمہ مع تفسیر سید محمد نعیم الدین مراد آبادی کا متن ملاحظہ کیجئے:۔

اگر تم نے ان سے مباہلہ کیا تو سب ہلاک ہو جاؤ گے اب اگر نصرانیت پر قائم رہنا چاہتے ہو تو انھیں چھوڑ دو اور گھر کو لوٹ چلو یہ مشورہ ہونے کے بعد وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کے گود میں تو امام حسین ہیں اور دست مبارک میں حسن کا ہاتھ اور فاطمہ اور علی حضور ﷺ کے پیچھے ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنھم اور حضورؐ ان سب سے فرما رہے ہیں کہ

جب دعا کروں تو تم سب آمین کہنا۔ ۳۳؎

ترجمہ فاضل بریلوی مع تفسیر سید محمد نعیم الدین مراد آبادی نے تفصیل سے واقعہ بیان کیا ہے کہ جب دوسرے روز عاقب وسید نے دیکھا تو کہا یہ اہل بیت رسول اللہ ہیں اور حضور ﷺ کی گود میں معصوم فرشتہ حسین ہیں اور حسن دونوں پیروں پر کھڑے ہیں اور دست مبارک میں حسن کا ہاتھ ہے کیا بیعت رضون میں علی ابن ابی طالب نے نہیں دیکھا جب ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو کہا یہ اللہ کا ہاتھ ہے دوسرا ہاتھ جو نیچے تھا کہا کہ محمد کا ہاتھ ہے گویا محمد کا ہاتھ حسن کے ہاتھ میں ہے اور فاطمہ بنت رسول اور علی ابن ابی طالب پیچھے ہیں جب مدینہ میں مباہلہ کی صورت قائم ہوئی تو کعبہ مرکز الٰہی تھا اور مسلمانوں کا قبلہ تھا تو نجرانیوں نے نہایت عاجزی سے ایک روز کی مہلت مانگی تھی تو وحدانیت کے بنیادی خیالات اور مبادیات کا مقصد تھا کہ اہل بیت کے لئے نہایت وقیع اور بنیادی وصف کی وضع داری کی اولین تمہیدی نگارش تھی جن کی حقیقت کی تفسیری نمائش تھی چنانچہ پیر محمد کرم شاہ الازہری نسیرۃ الرسول جلد چہارم میں یہ لکھا ہے ملاحظہ کیجئے:۔

دوسرے روز صبح سویرے خداوند ذوالجلال کے نبی برحق محمد رسول ﷺ تشریف لائے حضور کے ہمراہ حسنین کریمین، ان کی والدہ محترمہ حضرت خاتون جنت، اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسی برگزیدہ ہستیاں تھیں۔ ۴؎ ۳

بہر کیف سیرۃ الرسول جلد چہارم کے مصنف پیر محمد کرم شاہ الازہری نے لکھا کہ حضور ﷺ نماز عصر کے بعد مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے کہ نجرانی وفد آیا تو حضور ﷺ کو سلام! عرض کیا تو پیغمبری لب ولہجہ نے سلامتی سے محروم رکھا! اور نہ کوئی کلام کیا! تو مسجد نبوی سے باہر نجرانیوں کی ملاقات حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبدالرحمن بن عوف سے ہوئی چونکہ عہد قدیم سے باہمی تجارت کے روابطہ تھے قریشی ونجرانی کے آباؤ اجداد تجارت کی غرض وغایت سے آیا جایا کرتے تھے تو دوصحابیوں سے نجرانی علمائے اکابرین عاقب وسید نے کہا! کہ نبی کریم نے ہمیں بلایا ہے مگر سلام وکلام کی شکایت کی تو دوصحابیوں کے ایما پر حضرت سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کیا اور مزید مشورہ طلب کیا گیا! تو خانوادۂ بنو ہاشم کا چشم وچراغ، رمز شناس نبوت، مبدوفیض کا جوہر تاباں، مشکل کشائے جہاں نے کہا ''ان سے کہو کہ یہ ریشمی اور زرنگار قبائیں اتار دیں، سونے کی انگوٹھیاں انگلیوں سے نکال دیں اور اپنے سفر کا سادہ لباس پہن کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوں'' چنانچہ مولا علی کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے بارگاہ نبوی میں نجرانیوں نے سلام عرض کیا! تو جواب سے نوازا گیا تو خاتم

الانبیآء نے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو عاقب وسید نے کہا! آپؐ کی آمد سے پہلے ہم لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو! سنو اسلام قبول کرنے سے تمہیں تین چیزیں روک رہی ہیں'' تم صلیب کی عبادت کرتے ہو، خنزیر کھاتے ہو اور یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ اللہ کا ایک بیٹا بھی ہے''۔عقیدۂ تثلیث میں صلیب وخنزیر کا شامل ہونا واضح نہ تھا اور عیسائیوں نے مسخ شدہ نظام کے تحت عقیدۂ تثلیث کا نظریہ اخذ کیا تھا ظاہری طور پر رومی امور مملکت نے اعلان کیا تھا مگر ارکانہ ثلاثہ کے عمل پیرائیوں کے خلاف رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ صلیب، خنزیر اور ابن اللہ کی بات کرتے ہو جو کفر وشرک ہے۔اب علمی سطح پر زبانی گفتگو اور باہمی مشاورت سے ممکن نہیں! خداوند ذوالجلال نے کہا کہ اے رسول کہہ دیجئے! کہ اب مزید بات کرنی کی ضرورت نہیں! کلمہ وکلام کی کوئی حقیقت نہیں! گویا نجرانیوں نے سمجھا نہیں! کہ رسول کی بات وحی الٰہی ہوتی ہے یعنی منصب رسالت کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کو رسول کی زبان سے تعبیر کرتا ہے گویا رسول اللہ کی بات میں مشیت یزدی ہوتی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی شان اور بندگی کا اعلان مقصود تھا! ورنہ مکہ میں کفار ومشرکین نے حزن وملال کی کیفیت پیدا کی اور ظلم وستم نے مصائب وآلائم پیدا کئے مگر حضور ﷺ نے کبھی بھی ان کی ہلاکت وفلاکت کی بدعا نہ کی بلکہ کہا! ان کی آل واولاد سے آنے والی نسل اسلام سے مشرف ہوگی! مگر نجرانیوں نے عقیدۂ تثلیث سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کو مجروح کیا! تو حضور ﷺ نے کہا کہ میری بات سے انکار کرتے ہو تو آؤ ہم ایک دوسرے کے مقابل خداوند عالم کے حضور میں بدعا کریں! آہ وزاری کریں! اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں! چنانچہ نجرانی علما، حکما اور فضلا ڈر گئے بے حد خوف زدہ ہو گئے تو عاقب وسید نے قوم کی کمی وزیادتی کی پروا نہیں کی اور اپنی ہلاکت وفلاکت سے پہلے مصالحت کی پیشکش کی اور جزیہ کی ادائیگی پر راضی ہو گئے اور ذمّی رعایا بن کر رہنا پسند کیا۔

عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور وحدانیت کی آزمائشی منزل قریب ہوئی یعنی مباہلہ کے ذریعہ ابتلا کی گھڑی آئی تو پیغمبری لب ولہجہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حقانیت، اللہ تعالیٰ کی کبریائی عظمت اور اہل بیت کی رضا طلبی کی دلیل پیش کی گئی گویا اسلام کی تاریخ میں پہلی تلمیحات کی بشارت تھی اور تلافی مافات کی حکمت عملی کی پہلی تحریک تھی چونکہ پیغمبر کے مقابل کوئی پیغمبر نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے رسالت مآب ﷺ سے حضرت عیسیٰ کی شان نبوت وبندگی بیان کی یعنی حق اور سچ کو رونما کیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی عبادت کے لائق ہے جب نجرانیوں نے فر

شتہ صورت، نورانی عظمت، اہل بیت کو آغوش رسول میں دیکھا! تو نجرانی علما کی تعجیلی صورت کی تعریض پیش کی گئی بہر کیف تفسیر ابن کثیر اردو مئولف علامہ عبدالرشید نعمانی نے اس سورہ کی تفسیر بیان کی ہے اور حضرت جابر کی روایت نقل کی ہے ملاحظہ کیجئے:۔

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں ندع ابنآءنا الخ والی آیت انہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے انفسنا سے مراد خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ ابنائنا سے مراد حسن وحسین نسآئنا سے مراد حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنھا۔ ۳۵

گویا تفسیر ماجدی نے حقیقی نوعیت کو نمایاں کیا ہے بلکہ واضح کیا ہے کہ سورہ آل عمران کا حقیقی پہلو اور موضوع عقیدۂ تثلیث کا رد ہے گویا نجرانی عقیدۂ تثلیث کے درمیان جب مباہلہ کی صورت پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ندع۔ کہا جس سے دونوں فریق مخاطب ومراد ہیں ابنآء۔ سے مراد نواسہ و داماد ہیں نسآء۔ سے بیویاں اور بیٹیاں مراد ہیں چنانچہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی تفسیر ماجدی جلد اول کے حاشیہ کی تفصیلی نگارش دیکھئے اور آئینۂ ادبیات کی روشنی میں حقیقی شان کی وضاحت کی ہے اہل بیت کی عظمت اور پاکیزہ نفس کی حقیقت بیان کی ہے ملاحظہ کیجئے:۔

آپ نے فرمان خداوندی کے ماتحت مسیحیوں کو مباہلہ کی دعوت دے دی کہ زبانی گفتگو تو بہت ہو چکی اب آؤ ہم تم اپنے خاص اقربا کو لے کر اپنے پروردگار ہی سے بہ تضرّع والحاح عرض کریں کہ جو فریق ناحق پر ہو اس پر اللہ کی لعنت نازل ہو آپ نے یہ فرمایا اور اپنی اولاد حقیقی وحکمی یعنی سیدہ فاطمہ، سیدنا علی، سیدنا حسن، اور سیدنا حسین کو ہمراہ لے کر آپؐ تشریف لے آئے۔ ۳۶

حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حتمی، قطعی اور یقینی علم عطا کیا کہ مزید اتمام حجت کے سلسلے میں کسی قسم کی ردوقدح کی ضرورت نہیں گویا ردعمل سے یا زبانی کلمہ وکلام سے شدید کشمکش پیدا ہوتی ہے اب مناظرہ ومباحثہ کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی نہ بحث وتکرار کی گنجائش ممکن ہے سارے مبادیات کے پہلو مفقود ہو چکے۔ ہاں! باہم مبادلہ سے حضرت عیسیٰ کی نبوت کی تہمت کا ازالہ ممکن نہیں تو قرآن کی آیت مباہلہ نازل ہوئی تاکہ عقیدۂ تثلیث کو رد وباطل قرار دیا جائے چنانچہ نص قرآنی کے مطابق رحمت اللعالمین نے اپنے خاص اقربا کو منتخب کیا اور اپنے ہمراہ حسنین کریمین فاطمہ بنت رسول اور مولا علی کو لیا کہ بارگاہ رب العزت میں عذاب الٰہی کی بدعا کریں! اور اہل بیت سے بار بار کہہ رہے تھے کہ تم سب آمین کہنا! ظاہری طور پر نجرانی علما عاقب وسید نے دیکھا! تو کہا کہ اگر یہ لوگ پہاڑ ہٹانے کی بدعا کردیں تو اللہ پہاڑ کو جگہ سے بے جگہ کردیگا! خبردار ان لوگوں سے مباہلہ مت کرنا تم لوگ

ہلاک ہوجاؤ گے تمہاری نسلیں برباد ہوجائینگی ہاں! مفسرین ومحدثین کے نزدیک اہل بیت کی شہادت کی تکمیل ہوئی گم شدہ حقائق کے پہلو میں حضرت حنہ کی نذر کی تصدیق، حضرت عیسیٰ بن مریم کی تخصیص، اور اللہ تعالیٰ نے کن فیکون فرمایا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی گویا نفوس عالیہ کی شہادت یہ تھی وہ خالق کائنات ہے وہ سارے جہان کا پروردگار ہے وہ رب العالمین ہے۔

آخر کار حضرت علی کو آغوش رسول نے ممتاز کردیا! اے لوگو! کیا غزوۂ خیبر اور غدیر خم کا واقعہ معلوم نہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا ''من کنت مولاہ فعلی مولاہ'' میں جس کا دوست اور محبوب ہوں علی بھی اس کا دوست اور محبوب ہے تو حضرت علی کی حقیقت کیا پوچھو ہو! وہ اہل بیت ہیں وہ آل پیمبر ہیں محدثین، مفسرین، صوفیائے کرام اور مشائخ عظام کی نظر میں اہل سلاسل سنن کے اول امام ہیں گویا علم سینہ کے نکتہ شناس، علم باطن کے نقطۂ معراج اور دین شریعت کے منتہائے امان ہیں یہ حقیقت ہے کہ بنو ہاشم کے اول خلیفہ ہیں۔ بلکہ سنو! قیامت تک علوم ظاہری وعلوم باطنی کے منبع ومخرج کے بے مثل دروازہ ہیں۔

حواشی و مآخذ

(۱) سیرت الرسول جلد دوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۷۶/ فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی

(۲) سیرت الرسول جلد دوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۹۵/ فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی

(۳) خلفائے راشدین سید سلیمان ندوی ص ۲۶۵/ دارالمصنفین اعظم گڈھ

(۴) سیرت الرسول جلد دوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۹۸/ فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی

(۵) تاریخ ابن خلدون ابن خلدون جلد دوم ص ۱۲۷/

(۶) مکمل تاریخ اسلام سید امیر علی ص ۱۲/ آزاد بک ڈپو ہال بازار امرت سر۔ سال ندارد

(۷) سیرت الرسول جلد دوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۱۳۶/ ۱۳۷/ فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی

(۸) سیرت الرسول جلد دوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۲۳۰/ فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی

(۹) سیرت الرسول جلد دوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۲۳۰/ فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی

(۱۰) خلفائے راشدین سید سلیمان ندوی ص ۲۶۶/ دارالمصنفین اعظم گڈھ

(۱۱) القرآن حکیم ترجمہ امام احمد رضا خاں سورہ فتح۔ پارہ ۲۶/ آیت ۲۹ تاج کمپنی

(۱۲) القرآن حکیم ترجمہ امام احمد رضا خاں سورہ شعرا۔ پارہ ۱۹ آیت ۲۱۳ تاج کمپنی
(۱۳) خلفائے راشدین سید سلیمان ندوی ص ۲۶۸ / دارالمصنفین اعظم گڈھ
(۱۱۴) خلفائے راشدین سید سلیمان ندوی ص ۲۶۴ / دارالمصنفین اعظم گڈھ
(۱۵) سیرت الرسول جلد سوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۵۳ / فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی
(۱۶) المرتضیٰ مولانا سید ابوالحسن حسنی علی ندوی ص ۵۹ / مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو
(۱۷) القرآن حکیم ترجمہ امام احمد رضا خاں سورہ انفال۔ پارہ ۹ آیت ۳۰ تاج کمپنی
(۱۸) تفسیر ماجدی دوم مولانا عبدالماجد دریا آبادی ص ۲۸۶ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو
(۱۹) تفسیر ابن کثیر اردو مئولف علامہ عبدالرشید نعمانی نواں پارہ ص ۹۴ فرید بک ڈپو پرائیوٹ لمٹیڈ دہلی
(۲۰) تفسیر ابن کثیر اردو مئولف علامہ عبدالرشید نعمانی نواں پارہ ص ۹۵ فرید بک ڈپو پرائیوٹ لمٹیڈ دہلی
(۲۱) المرتضیٰ مولانا سید ابوالحسن حسنی علی ندوی ص ۶۱ / مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو
(۲۲) سیرت الرسول جلد سوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۱۷۴ / فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی
(۲۳) سیرت الرسول جلد سوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۱۶۱ / فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی
(۲۴) سیرت الرسول جلد سوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۱۶۱ / فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی
(۲۵) سیرت الرسول جلد سوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۲۰۵ / فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی
(۲۶) سیرت الرسول جلد سوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۴۲۴ / فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی
(۲۷) سیرت الرسول جلد سوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۵۷۵۔۵۷۶ / فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی
(۲۸) سیرت الرسول جلد سوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۶۲۳ / فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی
(۲۹) سیرت الرسول جلد سوم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۶۲۸ / فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی
(۳۰) سیرت الرسول جلد چہارم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۴۲۳ / فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی
(۳۱) سفرنامہ ناصر خسرو مترجم مولوی محمد عبدالرزاق کانپوری ص ۱۲۱۶ انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱

سنہ ۱۹۴ء
(۳۲) القرآن حکیم ترجمہ امام احمد رضا خاں سورہ آل عمران۔ پارہ ۳/آیت ۶۱ تاج کمپنی
(۳۳) القرآن حکیم ترجمہ امام احمد رضا خاں مع تفسیر سید محمد نعیم الدین صاحب سورہ آل عمران۔ پارہ ۳:۱۱۶ تاج کمپنی
(۳۴) سیرت الرسول جلد چہارم پیر محمد کرم شاہ الازہری ص ۶۵۵/فاروقیہ بک ڈپو جامع مسجد دہلی
(۳۵) تفسیر ابن کثیر اردو مئولف علامہ عبدالرشید نعمانی پارہ سوم ص ۷۶ فرید بک ڈپو پرائیوٹ لمٹیڈ دہلی
(۳۶) تفسیر ماجدی اول مولانا عبدالماجد دریا آبادی ص ۵۸۸ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنو

☆☆☆

Shan-e-Peer Panchaal : Farooq Muztar by Rubina Mir (Mandi, Poonch)

cell-7006056715

روبینہ میر (منڈی، پونچھ)

"شانِ پیر پنچال: فارق مُضطر"

ہندوستان کے دیگر خطوں کی طرح خطہ ءپیر پنچال بھی زمانہ ءقدیم سے علم وادب کا مرکز رہا ہے .اس سرزمین نے زندگی کے الگ الگ شعبوں سے تعلق رکھنے والی بہت سی عظیم شخصیات کو جنم دیا ہے .جن کے ناموں کی طویل فہرست ہے. معروف دانشور, ادیب ,شاعر ,افسانہ نگار اس سرزمین کی دین ہیں .فاروق مُضطر جیسی عظیم اور قدآور شخصیت بھی اسی سرزمین کی پیداوار ہیں .جموں کشمیر بالعموم اورخطہء پیر پنچال بالخصوص جس مایہ ناز سپوت پر ہمیشہ ناز کرے گی. اس شخصیت کا شمار دنیا کی عہد ساز شخصیت میں ہوگا .ان شاء اللہ .ایسی قابلِ قدر اور مثالی شخصیات صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں .

رسول پاک نے فرمایا تُم میں سے سب سے بہترین انسان وہ ہے .جو دوسروں کے ساتھ حُسنِ سلوک اور اچھا برتاؤ کرے .حضور نے بہترین انسان ہونے کا معیار یہ مقرر کیا ہے .کہ اُس کی زات دوسروں کے لئے فائدہ مند ثابت ہو .اس حوالے سے موصوف کی زات اپنے آپ میں ایک مِثال ہے ہر انسان کے لئے خوش اِخلاق وخوش اِخلاص ہونا ایک پُرکشش جذبہ ہے .اگر اس جذبے کو آپ نقطہءکمال پر دیکھنے کے خواہش مند ہیں تو آپ جناب فاروق مُضطر صاحب سے ایک بار ضرور ملیں...... کُچھ وقت اُن کی صحبت میں گزاریں .بقول شاعر

مجھے دیکھنا ہے جس نے میرے حال پر نہ جائے میرا ذوق وشوق دیکھے میرا انتخاب دیکھے

فاروق مُضطر کسی فردِ واحد کا نام نہیں .بلکہ اُس تحریک ,اُس انجمن کا نام ہے .جس نے 80 کی دہائی میں ہمالین ایجوکیشن مِشن نام کا ایک پودا لگایا .جس کی بے پناہ محنت اور لگن کے نتیجے میں دیکھتے ہی دیکھتے وہ پودا ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا .جس کی شاخیں راجوری کے گردونوح میں پھیلی ہوئی ہیں .اس درخت کے پھل اور سائے سے خطہء پیر پنچال ہی نہیں بلکہ ریاست اور مُلک کے کئی خِطوں کے لوگ فیض یاب ہورہے ہیں .خطہء پیر پنچال کی تاریخ میں جناب مُضطر صاحب کے کم وسائل کے باوجود بڑے کارناموں کی داستانیں سُنہرے حرفوں میں لکھی جائیں گی. کُچھ لوگ اتنے

عظیم ہوتے ہیں کہ اُن کی تعریف وتوصیف بیان کرتے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں. موصوب بھی انہی خوش نصیب شخصیات میں سے ایک ہیں. مضطر صاحب عظیم دانشور. صاحبِ اسلوب ادیب, اعلیٰ پائے کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی مزہب اِنسان ہیں. جنہوں نے اپنی محنت اور لگن سے ایک ایسا علمی , ادبی اور فکری جہان تشکیل دیا جو نئی سوچ اور فِکر کا ایک انوکھا منظر نامہ پیش کرتا ہے. وہ فرماتے ہیں.

دیکھو میری جبیں پر میرے عہد کے نقوش رکھو مجھے سنبھال کے اِک آئینہ ہوں میں

موصوف کو دُنیائے ادب میں بطورِ ادیب اور شاعر بھی بہت بلند مقام حاصل ہے جو اپنی تخلیق میں تعمیری انداز رکھتے ہے. یہ بات مسلم ہے کہ راتوں رات کوئی شخص, شخصیت کا روپ نہیں دھار سکتا..... بلکہ یہاں تک پہنچنے کے لئے خاک کے پُتلے کو خاک میں ملنا پڑتا ہے بقول شاعر:

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کُچھ مرتبہ چاہئے کہ دانہ خاک میں مل کر گل وگلزار ہوتا ہے

یا پھر یہ شعر کہ:

پھول یونہی کھلا نہیں کرتے بیج کو دفن ہونا پڑتا ہے

انسان کسی بھی شعبے کے ساتھ جڑا ہو اُس کا منفرد کردار ہی اسے شخصیت بنانے میں اہم رول ادا کرتا ہے. تاریخ گواہ ہے کہ لکیر کے فقیر اور غیر مُستقل مزاج افراد نمایاں ہوتے ہوئے بھی دنیا کے منظر نامے پر اپنا عکس نہیں چھوڑ سکتے. بلکہ اُن کا کردار دنیا کے منظر نامے پر گرد آلود نظر آتا ہے. ایسے افراد اپنے کام اور نام کی شہرت کے لئیبہت ساری تدبیریں کرتے ہیں. جن کا حاصل صفر کے برابر رہتا ہے. اس حوالے سے جناب فاروق مضطر صاحب اپنی خوش اِخلاقی دور اندیشی, باریک بینی , روشن خیالی, روشن ضمیری, نیک نیتی. اور مُستقل مزاجی کے سبب علمی اور ادبی دنیا میں اپنا مُنفرد مقام رکھتے ہیں. ان کی یہ صِفات ہی ان کی اصل پہچان ہیں. حضرت علی کا قول ہے. کہ انسان ایک دوکان ہے اور اُس کی زبان اُس کا تالا. تالا کھلنے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ دوکان سونے کی ہے یا کوئلے کی.....

خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو اپنی اچھائی کے سبب دوسروں کی دعاؤں میں رہتے ہیں. جو ہر ایک کے لئے مثبت سوچتے ہیں. مثبت بولتے ہیں. کیونکہ خوش کلامی اور مثبت روئے انسانی معاشروں کی بقاء واِستحکام کے ضامن ہوتے ہیں. خواب تو ہر کوئی دیکھتا ہے مگر خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کا جنون کسی کسی کے سر میں ہوتا ہے.

اس ضمن میں یہی کہا جا سکتا ہے. کہ کم وقت میں زیادہ سفر طے کر کے اس علمی وادبی دانشگاہ

کو اس مقام تک پہنچانے میں اس جنون کا سہرہ اس ادارے کے سرپرست و بانی جناب فاروق مُضطر صاحب کے سر ہی جاتا ہے. خطہء پیر پنچال کے اہلِ علم حضرات کے لئے ہمالین ایجوکیشن مِشن کا ترقی کی یہ منازل طے کرنا کسی خواب کے سچ ہو جانے جیسا ہے. لیکن سچ یہ ہے کہ یہ خواب کبھی پورا نہ ہوتا. اگر اس ادارے کے سرپرست و بانی مُضطر صاحب اس مِشن کو عملی جامہ پہنانے میں اپنا اہم رول ادا نہ کرتے. اس حوالے سے میں بقول جگر مُرادآبادی کہنا چاہوں گی.

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

اچھے اِخلاق اور سچے جذبوں میں اِخلاص ایک بیش بہا نعمت ہے. جو آج کے دور میں ہر کسی کے پاس نہیں. انسان کے احساس کا ترجمان اُس کا رویّہ ہوتا ہے. الفاظ کتنے بھی خوبصورت کیوں نہ ہوں انسانی احساس کی ترجمانی نہیں کر سکتے. اگر انسان کا رویّہ ٹھیک نہیں تو اُس کی زبان سے ادا ہوئے خوبصورت الفاظ بھی اُس کے غلط روئے کے زیرِ اثر اپنی خوبصورتی کھو دیتے ہیں. مُضطر صاحب بحیثیتِ انسان اِخلاقِ حَسنہ کے پیکر, نہایت خوش مِزاج ,پُر وقار ,دیانتدار ,مہمان نواز بامرَوّت اور باخلوص انسان ہیں.

موصوف نے اپنی زندگی کا اکثر و بیشتر حصہ علم و ادب کے لئے وقف کیا ہے. جس کی ایک نظر زمانے کی رفتا پر اور دوسری نظر قوم کی نبض پہ رہتی ہے.. "شانِ پیر پنچال" جناب فاروق مُضطر صاحب اُس عظیم شخصیت کا نام ہے. جس کی زندگی سے ہمیں بے شمار سبق ملتے ہیں.. ایسی ہی عظیم شخصیات کے لئے کسی شاعر نے کہا ہے

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں پھر خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

موصوف نے اپنی زندگی کے سفر کا آغاز شعبہء تعلیم میں سرکاری ملازمت سے کیا. سُبکدوشی کے بعد اپنے زاتی آرام اور سکون کو مُلک اور قوم کی خدمت پر قربان کر کے اپنی زندگی کا زیادہ سے زیادہ وقت نئی نسل کی آبیاری کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی خدمت میں گزار رہے ہیں. موصوف پسماندہ , یتیم مسکین بچوں کے لئے کسی مسیحا سے کم نہیں. اس ادارے کی بدولت کئی بیواؤں , غریبوں اور مسکینوں کے چولہے جل رہے ہیں. اللہ پاک مُضطر صاحب کے اس نیک عمل اور ان خدمات کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر اجرِ عظیم عطا کرے اور صحت و سلامتی کے ساتھ لمبی عُمر عطا کرے آمین۔

یہ سحَر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود ہوتی ہے بند مومن کی اذاں سے پیدا

(ڈاکٹر اقبال)

موصوف کا ہمالین ایجوکیشن مشن (ایچ, ای, ایم) کا اصل مقصد نسلِ نو کی تعلیم و تربیت ہے. جہاں مُسلم غیر مُسلم سبھی طلباء کے لئے دروازے کھلے ہیں. یہ علمی و ادبی درسگاہ نئے فکری رُجحانات کی ایک علامت ہے..... ایک تحریک ہے. جہاں نئی نسل کی کردار سازی اور تعمیرِ ملت کا سامان بھی محیا ہے. موصوف نے انسان دوستی کی بنیاد پر قلیل عرصے میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے, جو ناموری اور شہرت حاصل کی ہے. اس کے حصول میں بعضوں کو مُدتیں لگ جاتی ہیں. اور بعض مُدتیں گزر جانے کے بعد بھی گُمنام ہی رہتے ہیں.

مُضطر صاحب کا قلیل عرصے میں بہت زیادہ شہرت پانے کی پہلی وجہ تو یہ ہیکہ موصوف ماہرِ تعلیم, ادیب, شاعر, تنقید نگار و محقق ہونے سے پہلے ایک اچھے اور مخلص اِنسان ہیں. جنہوں نے قومی خدمت کو اپنا شعار بنایا. اچھا انسان اُس پھول کی مانند ہوتا ہے. جو کانٹوں میں رہ کر بھی ہر طرف اپنی خوشبو بکھیرتا ہے. ایسے انسان افرادِ خانہ کے ساتھ ساتھ پورے معاشرے, کے لئے نفع بخش ہوتے ہیں. جو ملک اور قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں. مُضطر صاحب کے قلیل وقت میں کئے تاریخی کاموں اور چند دہائیوں پر محیط علمی اور ادبی کارناموں کا احاطہ کرنا آسان نہیں.

. خطہء پیر پنچال کا یہ معتبر نام جنہیں اپنے تاریخی کاموں کی بدولت خطہء پیر پنچال کے سرسید احمد خان کے نام سے بھی منسوب کیا جاتا ہے, جانا اور مانا جاتا ہے. جو بیک وقت ماہرِ تعلیم, ادیب, شاعر, محقق و تنقید نگار ہوتے دیگر علوم کا بھی وسیع مطالعہ رکھتے ہیں. مہمان نوازی کے لئے بھی ریاستی اور مُلکی سطح پر اپنا مُنفرد مقام رکھتے ہیں. مہمان نوازی جو آدابِ اِسلام اور انبیاء و صالحین کی سُنت ہے. مُضطر صاحب اکثر اپنی علمی دانش گاہ میں مُلکی سطح کے ادبی پروگرام یعنی سیمینار اور مشاعرے منعقد کرواتے رہتے ہیں. مہمان کے آنے پر اُس کا پُر تپاک اِستقبال کرنا, اُسے خوش آمدید کہنا اور اُس کی خاطر تواضع مُضطر صاحب کا خاص وصف اور شیوہ ہے. حضرت عقبہ بن عامر سے مروی ہے. رسولِ پاک نے ارشاد فرمایا "جو شخص مہمان نوازی نہ کرے اُس میں کوئی خیر نہیں"

اس ضمن میں اگر دیکھا جائے تو فاروق مُضطر صاحب کا بحیثیتِ میزبان, بحیثیتِ مہمان نواز کوئی بدل نہیں.. میں نے اکثر موصوف کو مُلک کی کئی ریاستوں سے آئے مہمانوں کا خندہ پیشانی سے اِستقبال کرتے دیکھا. جو. اُن کے کھانے پینے اور دوسری خدمات کا خوش دلی سے

اِستقبال کرتے ہیں. وہ اکثر اپنے مہمانوں کو مُختلف اقسام کے عُمدہ اور لذیز کھانے کھلاتے ہیں. موصوف کے افکار کا دائرہ بہت وسیع ہے. کسی بھی معاشرے کی اصلاح میں ہمیشہ علم وادب کا اہم کردار رہا ہے.

حقیقت کے ادراک کا دوسرا نام علم ہے. علم دین کا ہو یا دنیا کا انسانیت کی بقاء کے لئے کسی طمغے سے کم نہیں. اسلامی تعلیمات میں علم اور اہلِ علم کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے. کیونکہ علم ہی انسان کو پستی سے بلندی کی طرف لے جاتا ہے. علم کو ترقی اور کامیابی کا زریعہ قرار دیا گیا ہے. علم غیر تہزیب یافتہ اقوام کو تہزیب کی دولت سے مالا مال کرتا ہے. ایسے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا. کہ جناب فاروق مُضطر صاحب نے خطہء پیر پنچال کے پسماندہ, بے سہارا نوجوانوں کو علم کے نور سے بہرہ ور کرنے کے لئے علم وادب کی جو قندیل روشن کی ہے. وہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک قیمتی سوغات اور سرمایہء حیات ہے. جس سے آنے والی نسلیں تادیر فیض یاب ہوتی رہیں گی.

جب کسی قوم یا معاشرے کو زوال آنے لگے تو اسے انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے اور انقلاب کی ابتدا علم وادب سے ہوتی ہے ہر دور میں ادب نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے مگر افسوس ہمارے بہت سے لوگ ابھی تک ادب سے نا آشنا ہیں اور چند ایک جو آشنا بھی ہیں تو وہ ادب کو اہمیت نہیں دیتے یا دینا نہیں چاہتے کیونکہ اس سے انہیں اپنی دوغلی پالیسیوں کا پردہ فاش ہونے اور خسارے کا ڈر ہوتا ہے ایسے لوگ اپنی علمی وادبی صلاحیتوں کو محض اپنی زات کے فائدے تک ہی محدود رکھتے ہیں. عجیب بات ہے لوگ انفرادی خسارے سے بچنے کے لیے اجتماعی خسارے پہ راضی رہتے ہیں۔۔۔۔ زبان, علم وادب کے فروغ کے لئے کچھ کرنے کے بجائے ادب کو سیاست اور دوسری سرگرمیوں کے حوالے کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی زبان, اور ادب کی خدمت کرنے والوں کی تعداد بہت کم رہ گئی ہے.

اس حوالے سے دیکھا جائے تو مُضطر صاحب ہمہ وقت علم کے ساتھ ساتھ ادب کو فروغ دینے میں بھی اپنا اہم رول ادا کر رہے ہیں. بقول حالی:

بہت دل خوش ہوا حالی سے مل کر ابھی کُچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

خطہء پیر پنچال میں بہت سے پرائیویٹ تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں. لیکن ہمالین ایجوکیشن مِشن کی انفرادیت یہ ہے کہ اس علمی اور ادبی درسگاہ نے اردو زبان وادب پر بھی گہرے نقوش چھوڑے ہیں. مضطر صاحب کی سرپرستی میں چند ادبی مجلّے بھی شایع ہو رہے ہیں جس سے زبان

کو وُسعت مل رہی ہے۔ اگر وسیع زاویہء نگاہ سے دیکھا جائے تو اِس ادارے کا خاص مقصد قوم کی سیاسی ،سماجی اور معاشی پسماندگی دور کرنا ہے۔یعنی قوم کو پسماندگی سے ترقی کی جانب مائل کرنا ہے۔

فاروق مُضطر صاحب کے تاریخی کاموں کی فہرست بہت طویل ہے۔ تصنیف وتالیف اور مطالعہ مُضطر صاحب کا محبوب مشغلہ ہے۔اسی وجہ سے موصوف نے مُلک کے کونے کونے سے آنے والے اُدباء اور شعراء کے لئے ایک پلیٹ فارم مہیا کر رکھا ہے۔ معمارِ قوم مُضطر صاحب کے فکر وعمل کے کئی میدان ہیں۔ جن میں بچوں کی تعلیم وتربیت اور ادب بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ جن کے خاص نظریات سے ہمالین ایجوکیشن مِشن نے تحریک کی شکل اختیار کی۔ہمالین ایجوکیشن مِشن کے زیرِ سایہ تین ہائیر سیکنڈری اسکولز ایک ڈگری کالج اور ایک بی۔ایڈ کالج کام کر رہے ہیں۔ جہاں ریاست اور بیرونِ ریاست کے سینکڑوں پڑھے لکھے نوجوانوں کو روزگار کے مواقع فراہم ہوئے ہیں۔اس ادارے میں جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ آئے روز نئی نسل کے لئے تہزیب وتمدن ،ثقافت انسانی بھائی چارے کے فروغ کے لئے طرح طرح کے رنگارنگ پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں۔

ہمالین ایجوکیشن مِشن ایک ایسا ادارہ ہے۔جس نے اپنی انسان دوستی اور ادب دوستی کی بنیاد پر مُلک بھر کے قلمکاروں بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ادبی ستاروں کو یکجا کرنے کے لئے ایک پلیٹ فام فراہم کر رکھا ہے۔ جہاں وہ ریاستی اور مُلکی سطح پر اپنے فن کا لوہا منوا رہے ہیں۔ اس علمی وادبی دانش گاہ کا ضرورت کے تحت مُختلف عنوانات پر مُنفرد انداز کے پروگرام کروانے کا مقصد نوجوان نسل کے زہن وفکر کے دریچے کھولنا ہے۔ موصوف اکثر نوآموز قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ مجھے زاتی طور پر ادبی سفر میں جن شخصیات کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی حاصل رہی ان میں جناب مُضطر صاحب کا نام سرِ فہرست ہے۔ میری تیسری کتاب کا نام" حرفِ راز " بھی مُضطر صاحب کا ہی اِنتخاب ہے۔ اس دجالی دور میں جہاں ہر کوئی دوسرے کو نیچا دکھانے کے چکر میں مصروف ہے۔ جہاں بھائی بھی بھائی کے نقصان سے خوش ہوتا ہے۔ ایسے اشخاص کا وجود معاشرے میں کسی نعمت سے کم نہیں۔ بقول شاعر:

اک سمندر ہے جو طوفان سے خوش ہوتا ہے میرا بھائی میرے نقصان سے خوش ہوتا ہے
آپ کے ہنسنے سے احساس ہوا ہے مجھ کو ایک خوشحال پریشان سے خوش ہوتا ہ....!!!

ان کی ان خدمات کی بدولت انھیں ریاستی اور مُلکی سطح پر کئی اعزازات سے نوازا گیا ہے۔جن کی ایک طویل فہرست ہے۔۔یہ تمام باتیں سرہائے جانے کے لائق ہیں۔

اس ادارے سے نکلے سینکڑوں نوجوان مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔

خدمتِ خلق ایک ایسا پاکیزہ جذبہ ہے. جو انسان کو قدرت کی طرف سے عطا ہوتا ہے. یہ جذبہ رکھنے والے کبھی کسی انعام کی خواہش نہیں رکھتے. بلکہ مُلک اور قوم کی بہتری کے لئے زاتی اغراض اور فائدوں کو قربان کر دیتے ہیں جناب فاروق مُضطر صاحب اس جزبے سے بھی مالا مال اور سرشار ہیں.. سچ یہ ہے کہ مُضطر صاحب کی شخصیت ایک بہرِ بیکراں کی مانند ہے. جس میں جتنا اُترو گہرائی بڑھتی ہی جاتی ہے. بہرحال میں نے اپنی بساط کے مطابق کوشش کی کہ اس بحرِ بے کراں سے کچھ موتی چُن پاؤں. ہمالین ایجوکیشن مِشن نے قوم اور مُلک کو بیشمار ڈاکٹر, انجینیر پروفیسر کے, اے, ایس اور آئی, اے ایس آفیسر دئے ہیں جو جموں کشمیر کے علاوہ مُلک کے مختلف حصوں میں ملک اور قوم کی خدمات انجام دے رہے ہیں. یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ سب جناب فاروق مضطر صاحب کے بلند حوصلے, پُختہ عزم, اور جہدِ مسلسل کا ثمر ہے. مضطر صاحب کے نام یہ شعر کر کے اجازت چاہتی ہوں

مجھ پہ تحقیق میرے بعد کرے گی دُنیا مجھے سمجھیں گے میرے بعد زمانے والے

☆☆☆

Dabistan-e-Himala, Dhanak aur Farooq Muztar by Dr. Jawed Anwar
(Varanasi) cell-9935957330

ڈاکٹر جاوید انور (وارانسی)

دبستان ہمالہ، دھنک اور فاروق مضطر

فاروق مضطر شہر راجوری جموں و کشمیر، خطۂ پیر پنچال کی شاید وہ واحد شخصیت ہیں جو اپنے علم، اپنی دولت اور اپنے رسوخ کا استعمال اردو زبان و ادب سمیت زندگی کے تمام شعبہ ہائے علوم کی فلاح و بہبود اور آبیاری کے لئے کرتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ تب سے جاری و ساری ہے جب ان کے پاس صرف علم تھا، دولت اور رسوخ نہ تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ اگر نئے کپڑے اور اہم کتابوں کی اشد ضرورت ہو اور ان میں انتخاب کرنا ہو تو فاروق مضطر کتاب خریدنے کو ترجیح دیتے تھے اور پرانے کپڑوں سے کام چلاتے تھے۔ اسی دوران انہوں نے ۱۹۷۳ء میں ایک ادبی جریدہ ''دھنک'' کے نام سے جاری کیا۔ جس کی اشاعت کچھ ہی وقتوں تک قائم رہ سکی۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ فاروق مضطر ''دھنک'' جاری نہیں رکھ سکتے تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان کی اضطرابی صفت نے ''دھنک'' کے توسط سے خطۂ پیر پنچال کی مکمل تعلیمی صورت حال کا احاطہ کر لیا جس کا فروغ ان دنوں ''دھنک'' کے توسط سے ادب کی خدمت سے اہم اس علاقے کی تعلیمی خدمات کا متقاضی تھا۔ ''دھنک'' سے اردو کی آبیاری مقصود تھی اور تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا مقصد نسلوں کی آبیاری تھا، جس کے لئے ''دھنک'' میں صرف ہونے والا وقت بھی درکار تھا۔ فاروق مضطر نے اس اہمیت اور ضرورت کو سمجھتے ہوئے خود کے تمام اوقات کو اسی عظیم مقصد کے لئے وقف کر دیا اور آج ان کی کاوشوں کا ثمر کئی تعلیمی اداروں کی شکل میں راجوری اور اس کے قرب و جوار میں خطۂ پیر پنچال کی کئی نسلوں کی زندگی سنوارتے ہوئے آگے کے مراحل طے کر رہا ہے۔

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ میرے خیال میں اگر فاروق مضطر ادیب و شاعر نہ ہوتے، صحافی نہ ہوتے تو شاید اس عظیم مقصد کی حصولیابی اس طور نہ ہوتی۔ ان کا اضطرابی اور ''تازہ و یرانے کی سودائے محبت کو تلاش'' والا ذہن جو یقیناً ان کی ادبی خلاقیت کا مرہون منت ہے، کا اس ضمن میں سب سے اہم کردار ہے۔ ''دھنک'' کی اشاعت ملتوی تو ہوگئی لیکن مضطر صاحب کے ادبی

خدمات کے ارادے ملتوی نہیں ہوئے۔اپنے ذاتی صرفہ سے سال میں کئی کئی ادبی تقریبات،ادبی کتب کی اشاعت،ادیبوں کو اعزاز وغیرہ کا سلسلہ تو نہ جانے کب سے ہے، ادھر کچھ عرصے سے ''دبستان ہمالہ'' کی صورت میں منفرد ادبی مجلّے کی اشاعت نے اپنے مواد کے اعتبار سے تمام شعبہ تعلیم سے تعلق رکھنے والے اہل اردو جن میں ادب سے وابستہ افراد بھی ہیں، کے علاوہ انگریزی زبان کے عالموں اور اس زبان سے شغف رکھنے والوں کو بھی اپنی جانب منعطف کیا ہے۔اس کے ساتھ ہی پچھلے سال سے ''دھنک'' کی ازسرنو اشاعت کا سلسلہ جہاں ان کے ادبی ذوق کے سالم رہنے اور اس کی تسکین کے عملی رویوں کی جانب ذہن کو منتقل کرتا ہے وہیں یہ سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ کیا محض اپنی ادبی تسکین کے لئے ''دھنک'' کی اشاعت کی ازسرنو ابتداً کی گئی ہے یا اس میں اس دور میں جو مواد شائع ہوتا تھا،یعنی آج سے ۵۰ سال قبل،اس کی نصف صدی کے بعد بھی کوئی قدر و منزلت باقی رہی ہے۔؟ یا ان کے امکانات مستقبل قریب میں بھی کسی طور ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں؟

ان تمام کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ''دھنک'' کے پہلے شمارے کی مشمولات پر غور کیا جائے جو کہ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا ،میں عادل منصوری،بلراج کومل،عمیق حنفی،نشتر خانقاہی،مظفر حنفی، جوگندر پال،کرشن کمار طور،غلام مرتضیٰ راہی،شمس الرحمن فاروقی،ظفر صہبائی،صلاح الدین پرویز،عرش صہبائی، عابد مناوری،نور شاہ،حامدی کشمیری،حکیم منظور، ہمدم کاشمیری،ظہور الدین،شجاع سلطان،آنند لہر،مظفر ایرج،خالد حسین، فاروق نازکی، عابدہ احمد،یٰسین بیگ، پرتپال سنگھ بیتاب،احمد شناس،مسعود سامون،شہباز راجوروی،بلراج بخشی،خورشید بسمل،صابر مرزا،مصور سبزواری اور خود فاروق مضطر کی ایک غزل شامل ہے۔

نظموں،غزلوں پر غور کیا جائے تو یہ اپنے دور کے جدیدیت کے رجحان کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ آج کے عہد سے کس قدر منسلک ہیں، ان کے مطالعے سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔یہ تمام فنکار جو اس میں شامل ہیں،ان کی تخلیقات کو کسی محدود عہد میں مقید کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔دلیل کے طور پر اگر اس وقت کا فاروق مضطر کا اداریہ ہی دیکھا جائے:

''اردو میں تو خرید کر پڑھنے والوں کی تعداد مایوس کن ہے۔ایسے حالات میں کسی ادبی،علمی جریدے کا اجراء دیوانے کا خواب لگتا ہے اور ہم اس کے باوجود ''دھنک'' کے اجراء کا تجربہ کر رہے ہیں۔ظاہر ہے کہ یہ تجربہ جبھی کامیاب ہو سکتا ہے جب اصحاب ذوق اور علم دوست حضرات ''دھنک'' کو معیاری مضامین و تخلیقات سے تعاون دیں۔

اس سلسلے میں ہمیں حسب خواہش تعاون نہیں ملا۔اردو رسائل و جرائد کا المیہ یہ بھی ہے کہ اہم لکھنے والے عام طور پر ایسے رسائل میں چھپنا پسند کرتے ہیں جن کی سرپرستی وارث علوی کی زبان میں ''علم و ادب کے بڑے بھائی لوگ'' کرتے ہوں۔ تاہم جہاں کہیں کسی مدیر کی خواہش ہو کہ وہ اپنے جریدے کو خوب سے خوب تر بنائے، وہاں لکھنے والوں کا بھی فرض ہے کہ وہ معیاری مضامین و تخلیقات سے تعاون دیں۔

اس سلسلہ میں ہم نے ''دھنک'' کا مزاج و معیار متعین کرنے کے لئے دوسرے رسائل و جرائد یا کتابوں سے چند معیاری نگارشات اخذ کی ہیں،اس سے ہمارا مقصد یہی ہے کہ ''دھنک'' بلند ذوق قارئین کو متوجہ کر سکے۔

''دھنک'' کے اجراء سے ہمارا بنیادی مقصد ریاست جموں و کشمیر میں ادب وفن میں نئے نئے رجحانات ومیلانات سے علم دوستو اور ادب پسندوں کو باخبر رکھنا اور تحریک وترغیب دینا ہے۔لہذا ان مسائل پر بحث وتمحیص کے لئے ''دھنک'' کے صفحات وقف ہیں۔مگر ادب شرط ہے۔مختلف رسائل و اخبارات میں ''دھنک'' کو ''سنگ میل'' کے نام کے تحت مشتہر کیا گیا تھا لیکن بعض وجوہ سے بعد میں اسے ''دھنک'' کرنا پڑا۔قارئین اور قلمکار حضرات نوٹ فرمالیں۔''

غور کیا جائے تو ادارئے کی بیشتر باتیں زمانے کی تغیر پذیری کے ساتھ اپنی اضافی صورت میں آج بھی موجود ہیں۔آج بھی مسئلہ رسالہ اور کتاب خرید کر پڑھنے کا جوں کا توں ہے۔سوشل میڈیا نے پی ڈی ایف کاپی یا اردو ان پیج فائل کی سہولت تو عطا کی ہیں جن کو موبائل میں ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھا جا سکتا ہے لیکن اس سے آنکھوں پر بہت مضر اثر ہوتا ہے۔

یعنی ہر صورت میں کتاب آج بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی پہلے تھی اور آج بھی کتب و رسائل کی خریداری کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔اس کے ساتھ ہی معیاری تحریروں کی اشاعت کے لئے کسی ''بڑے بھائی کا رسالہ'' تو اب شاید موجود نہیں ہے لیکن اس رویے میں فقط اتنی تبدیلی آئی ہے کہ اس قسم کی تحریروں کو ان سرکاری رسائل میں اشاعت کے لئے ارسال کیا جاتا ہے جہاں سے کچھ رقم حاصل ہو سکے۔ظاہر ہے کہ اس سے غیر سرکاری رسائل کے معیار و وقار پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں ،اندازہ کیا جا سکتا ہے۔اس طرح غور کیا جائے تو دوسرے کتب ورسائل میں شامل اہم تحاریر کو اپنے رسالے میں شائع کرنا جہاں اس دور کی ایک اہم ضرورت تھا، وہیں آج بھی ہے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ''دھنک'' کے سرورق'' پر جو یہ تحریر درج ہے کہ:''معیار و اقدار کا نیا میزان'' وہ بالکل درست

ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ''دھنک'' اپنے پہلے زمانے میں نئے رجحان کی نمائندگی کرنے والا خطہ ء پیر پنچال کا پہلا اور واحد رسالہ تھا، آج بھی اس کی مشمولات آج کے زمانے کی اعلیٰ معیاری تحریروں میں بلا کسی مبالغے کے شامل ہیں۔ علاوہ تخلیقی ادب کے اگر تنقیدی مضامین پر ہی غور کرلیں تو بلراج کومل کا مضمون ''جدید ادب: ایک رویہ'' آج بھی اپنے آفاقی خیالات کے سبب وہی اہمیت رکھتا ہے بلکہ آج علم کے زوال کے دور میں اس کی قدر میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کے غالب کے ایک شعر کی تفہیم اور حامدی کاشمیری کا مضمون ''نئی حسیت کا مفہوم'' ایسے شاہکار ہیں جو آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ''دھنک'' کی اپنے ۱۹۷۳ کے مواد کے ساتھ از سر نو اشاعت کوئی جذباتی عمل نہیں ہے بلکہ نئی نسل کو تخلیقی تحقیقی اور تنقیدی سطح پر ان اسلوبیات سے روشناس کرانا ہے جن کا جاننا آج کے طالب علم اور نئے ادیبوں کے لئے لازمی ہے۔ ''دھنک'' کے دوسرے شمارے کی مشمولات پر نظر ڈالنے سے قبل اس کے اداریے میں شامل یہ سطور بھی بڑی اہم معلوم ہوتی ہیں:

''۱۔ تحقیقی مقالات اور جدید شعر و افسانہ کے مسائل پر مضامین ترجیحاً شائع ہوں گے۔

۲۔ افسانے اور تخلیقات ہمارے مزاج و معیار کے مطابق ہوں۔

۳۔ نوجوان شعرا اپنی پانچ نمائندہ تخلیقات ہمیں بھیجیں تا کہ مزاج و معیار کا اندازہ ہو سکے۔

۴۔ رزم و بزم کے تحت صرف وہی خطوط شائع ہو سکیں گے جن میں پچھلے شمارہ کے مشمولات کے خوب و ناخوب سے تفصیلی بحث ہو۔ سرسری تبصرے اور رسمی تعریف و توصیف کے حامل خطوط شامل اشاعت نہ ہو سکیں گے۔''

اس شمارے کی مشمولات پر غور کریں تو راج نارائن راز، جگن ناتھ آزاد، عتیق اللہ، مظہر امام، رحمن راہی، نصر قریشی، نصیر پرواز، قاضی عبید الرحمن ہاشمی، اسعد بدایونی، رفیق راز، عابد پیشاوری، ظہیر غازیپوری، یوسف جمال، وحشی سعید، ابن فرید، اختر یوسف، سلام بن رزاق، ایاز رسول نازکی، رخسانہ جبین، وریندر پٹواری، منظر اعظمی، عشرت کاشمیری، محمد ایوب شبنم، مشتاق فریدی، نثار احمد صدیقی، اقبال نازش، رشید قمر، ڈی کے کنول، اور فاروق مضطر کا ''نئے کلاسیک۔ مرتبین: بشر نواز، جوگندر پال، قاضی سلیم'' پر ایک تبصرہ شامل ہے۔

اس شمارے میں بھی تحقیقی مقالات اور جدید شعر و افسانہ کے مسائل پر جو مضامین شامل ہیں، وہ کسی مخصوص عہد کے لئے اختصاص نہیں رکھتے بلکہ ان میں وہ نکات بیان کئے گئے ہیں جن سے

ہر تخلیق کار کا ہر دور میں واسطہ پڑتا ہے۔جگن ناتھ آزاد کا مضمون ''اردو شاعری میں فکر اور جذبے کی کشمکش'' کا دوسرا پیراگراف ملاحظہ ہو۔

''عظیم ادب کے بارے میں کالرج نے کہا ہے کہ عظیم فکر کے بغیر اس کی تخلیق ممکن نہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تنہا فکر ہی کسی نثر پارے یا نظم کو ادب العالیہ کے مقام نہیں دے سکتا۔اونچا خیال یا گہرا تفکر جب تک جذبے میں نہیں جاتا، اس وقت تک ادب العالیہ کی تخلیق کا مقصد اس سے دور رہتا ہے۔غالب اور اقبال کی شاعری ہو یا پریم چند، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کے افسانے ہوں یا محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد کی نثر ہو، ان سب کے تجزیے سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ فکر کی شدت نے انجام کار جذبے کا روپ اختیار کیا ہے تو یہ فن پارے معرض وجود میں آئے ہیں۔''

کیا مندرجہ بالا اقتباس کسی خاص عہد کے خانے میں محدود کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس کی قدر و قیمت اور اہمیت اس طور مسلم نہیں ہے کہ یہ موجودہ اور آنے والے زمانے کے تخلیق کاروں کے لئے بھی مشعل راہ ہے؟ ''دھنک'' کی از سر نو اشاعت کے جواز کی صورت میں اس شمارے میں شامل دوسرا مضمون ''ہندوستانی سماج کی تشکیل نو میں ادب کا حصہ'' جو رحمن راہی کا ہے، پیش کیا جا سکتا ہے۔اس کی ابتداء یوں ہوتی ہے:

''ہندوستانی سماج کی آجکل جو نئی تشکیل ہو رہی ہے، اس کا عمل بڑا پیچیدہ ہے۔یہ عمل بیک وقت شکست و ریخت کا بھی ہے اور تعمیر و تزئین کا بھی۔نئے سماج کے معماروں کے سامنے دو طرح کے مسائل ہیں، ایک وہ جو اس جاگیرداری نظام کی پیداوار ہیں، جسے انگریزی سامراج جاتی دفعہ نیم مردہ حالت میں چھوڑ گئے تھے اور دوسرے وہ جو مستقبل سے متعلق اشتراکی نصب العین کے گویا قدرتی تقاضے ہیں۔''

غور کیا جائے تو آج کے سماج کی تشکیل کی بھی کیا وہی نوعیت نہیں ہے جس کا رحمن راہی صاحب نے اس دور میں ذکر کیا ہے۔جاگیرداری نظام جو اس وقت نیم مردہ حالت میں تھا اور اشتراکیت کے درمیان سماجی کشمکش کیا اب بھی نہیں ہے؟ تغیر پذیری جو وقت اور زمانے کے آگے بڑھنے کا لازمی جزو ہے، کے آئینے میں بھی غور کریں تو بنیادی مسائل اب بھی وہی ہیں جو رحمن راہی کے مضمون کا موضوع ہیں۔اسی طرح قاضی عبید الرحمن ہاشمی کا مضمون ''شعری منطق اور عصریت: بحوالہ اقبال'' بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے کسی بھی زمانی قیود کو قبول نہیں کرتا۔مضمون کی ابتدائی سطریں ہی اس کی وضاحت کر دیتی ہیں۔

''حقیقی فنکاری کا مدعا ابدیت کی تشکیل بھی ہے اور ابدی صداقتوں کے سرچشموں کی جستجو اور اثبات بھی۔ادب زماں کی کسی بھی حالت ماضی، حال یا مستقبل کے دائروں یا ساعتوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔ یہ حدود اس کے امکانات کی وسعتوں کے لئے نہ صرف ناکافی بلکہ نقصان دہ بھی ہیں۔اس کی حسیت دوامی حال ہی کے تناظر میں سمجھی جاسکتی ہے۔''

غرض ''دھنک'' کے اس دوسرے شمارے کی مشمولات بھی موضوع ومواد کے اعتبار سے ایسے نہیں ہیں کہ جن کا تعلق آج کے غالب موضوع یا غالب رجحان سے نہ ہو۔ یہ مواد اس دور میں جتنے کارآمد تھے اب اس سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔اس سلسلے میں عابد پیشاوری کا مضمون بہ عنوان ''یونیورسٹیوں میں تحقیق کا معیار'' جو ۱۹۷۴ء کے پہلے کی تحریر ہے، آج کی صورت حال کی کس قدر حقیقی نمائندگی کرتا ہے، اس کے مطالعے سے سمجھا جاسکتا ہے۔نثار احمد صدیقی کا انٹرویو ''جدیدیت کیا ہے؟ جمیلہ شاہین، گوپی چند نارنگ اور وہاب اشرفی'' اس رجحان کی بنیاد کو سمجھنے اور عصر حاضر میں جدیدیت کی خوبی وخامی کے تعین میں بہت اہم ہے۔فاروق مضطر کا ''نئے کلاسیک'' پر تبصرہ بھی اس کتاب کی آج کی اہمیت پر دال ہے۔ان دو شماروں کی روشنی میں پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ''دھنک'' کے وہ چند شمارے جو اس دور میں شائع ہوئے، آج کے عہد میں از سر نو اشاعت کا نہ صرف اپنا ایک مستحکم جواز رکھتے ہیں بلکہ آج کی اردو دنیا کی ایک اہم ضرورت بھی ہیں کہ نئے ذہن اس سے روشنی حاصل کریں کہ اعلیٰ معیاری تحریریں کیا ہوتی ہیں، کس طرح ان کا انتخاب کر کے ایک رسالہ ترتیب دیا جاتا ہے کہ اس کی اہمیت اور انفرادیت آئندہ زمانوں تک باقی رہتی ہے۔

''دبستان ہمالہ'' ہمالین ایجوکیشن مشن سوسائٹی کا ایک ایسا سہ ماہی رسالہ ہے جسے اس کی نوعیت کے اعتبار سے ہندوستان، پاکستان اور بیرون ممالک میں موجود پوری اردو دنیا کی تاریخ میں اب تک کا پہلا ایسا رسالہ تسلیم کیا جا سکتا ہے جس میں تمام اہم شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شاہکار شخصیات، ان کی تحاریر اور ان پر لکھی گئی تحاریر کو اس مجلّے کے احاطے میں سمیٹ لیا گیا ہے۔اس کی اشاعت کا جو مقصد ہے وہ اس کے سرورق پر عبارت سے واضح ہو جاتا ہے کہ ''تہذیبی، ثقافتی، علمی، ادبی، تعلیمی، تعمیری مجلہ'' اور ''گنگا جمنی تہذیبی روایت کا امین و انسانیت کا علمبردار''۔اس کے شمارہ ۶، اپریل تا جون ۲۰۲۳ء کا مطالعہ کیا جائے تو اے ۴ سائز کے اس مجلّے کے سرورق پر جو تصاویر ہیں وہ مولانا وحید الدین خاں، خان عبدالغفار خان، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر رحمن راہی کی ہیں۔ پشت ورق پر گرونانک دیو جی، لال بہادر شاستری اور ڈاکٹر ذاکر حسین

کی تصاویر ہیں۔ ۶۴ صفحات کے اس شمارے میں ۱۶ صفحات انگریزی میں بھی ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ باقی ۴۸ صفحات جو اردو میں ہیں، ان میں سے کسی ۱۶ صفحات کے اردو مواد کا انگریزی میں ترجمہ ہے بلکہ انگریزی کے اس حصہ کی اپنی انفرادیت ہے۔ اس سے گمان غالب ہے کہ آئندہ کے کسی شمارے یا شماروں میں ہندی کے لئے بھی کچھ صفحات مختص کئے جائیں۔ اس شمارے کے اردو اور انگریزی حصہ میں شامل مشمولات کی فہرست پر ہی غور کر لیا جائے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس مجلّے کے مقصد کے تعلق سے جو تحریر سرورق پر درج ہے یعنی کہ ''تہذیبی، ثقافتی، علمی، ادبی، تعلیمی، تعمیری مجلہ'' اور ''گنگا جمنی تہذیبی روایت کا امین و انسانیت کا علمبردار'' تو اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ خدمات کے سلسلے میں مزید اضافہ کرتے ہوئے مختلف ادبی اور ثقافتی پروگراموں نیز مختلف ادبی، ثقافتی اور سیاسی وغیرہ شخصیات کی خدمات کے اعتراف میں اعزازی تقریبات کا اہتمام اور ان کو مختلف ایوارڈ سے سرفراز کرنا ایسا عمل ہے جو یہ باور کراتا ہے کہ فاروق مضطر کی نظر زندگی کے ہر شعبہ اور بالخصوص خطہء پیر پنچال کی زندگی کے ہر شعبہ پر گہری ہے اور وہ مختلف طریقوں سے اس خطہ میں تعلیمی، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ میں خود کی زندگی کو وقف کئے ہوئے ہیں۔ اسی لئے انہیں خطہء پیر پنچال کا سرسید کہا جاتا ہے جو بلا مبالغہ سو فی صد درست ہے۔ اس سلسلے میں سرسید احمد خاں کی کارکردگی اور فاروق مضطر کی کارکردگی کا مختصر ذکر لازمی ہو جاتا ہے۔

۱۔ سرسید نے قوم کی تعلیمی بدحالی کو ملکی پیمانے پر دیکھا اور چونکہ وہ خود اعلیٰ خاندان جو ہر طرح سے فارغ البال تھا، دھن دولت عیش وعشرت کی کوئی کمی نہ تھی، کے فرزند تھے اور خود اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور بنارس شہر اور ملک کے دوسرے ایسے مقامات سے اپنی سرگرمیوں کی ابتدا کی جو مرکز میں تھے۔ ان کو پورے ملک کے بڑے بڑے نوابین، رئیسوں اور انگریزوں تک کا ساتھ ملا، مالی تعاون ملا اور ملتا رہا جس سے علی گڑھ میں ایک اسکول کا قیام اور بعد میں اس کی یونیورسٹی کی صورت۔ اس کے لئے انہوں نے پورے ہندوستان جس میں غیر منقسم پاکستان بھی شامل ہے، کے کتنے دورے کئے ہم سب جانتے ہیں۔ فاروق مضطر جنہوں نے ایک تقریباً مفلس گھر میں جنم لیا اور اپنے خطہء کی تعلیمی بدحالی پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلی بڑی قربانی یہ دی کہ اپنا سب سے پسندیدہ مشغلہ یعنی ادب کی تخلیقیت کو عرصہ دراز کے ملتوی کر دیا اور ایک کرائے کے کمرے سے پرائمری کلاس کے ساتھ تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میں ان کے ساتھ ان کے والد تھے جو خود ہائی اسکول تک کے ایک استاد تھے اور اس زمانے میں مدرس کی تنخواہ کتنی ہوتی تھی، ہم سب اس سے واقف ہیں۔ یعنی جس طرح سرسید کو مالی

تعاون حاصل ہوا، فاروق مضطر اس سے پوری طرح مرحوم رہے،لیکن مشن ان کا بھی اپنے خطہ کی محدودیت تک جہاں ہر قسم کی پس ماندگی اور آمدورفتکی دشواریاں اپنے عروج پر تھیں، وہی تھا جو سرسید کا ملکی سطح پر مرکز میں رہ کر تھا۔ان کے مسائل جدا تھے،انہوں نے بہت لکھا بھی، اخبارات ورسائل بھی شائع کئے ،لیکن فاروق مضطر کا علاقہ مرکز سے بالکل کٹا ہوا ایسا دشوار گزار پہاڑی علاقہ اب بھی ہے کہ بہت سی آج کی جدید سہولتوں کے باوجود اکثر برفباری کے دنوں میں یا موسم کی خرابی کے دنوں میں پورے ملک سے تقریباً کٹ جاتا ہے۔نہایت مفلس خطہ جو ہر طرح سے اس دور میں پس ماندہ تھا اور ٹرین کی سہولت تو اب تک نہیں ہے،اس دور میں بجلی پانی اور سڑک جیسی بنیادی سہولیات اور روزگار کے امکانات کتنے رہے ہوں گے،اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔اس پر یہ بھی کہ ایک عرصہ تک ملی ٹینسی کا دور اور ان سب سے جوجھتے ہوئے نئی نسلوں کو تعلیم کی اہمیت سے روشناس کرانے اور خطہ پیر پنچال کی قوم کے فروغ میں اہم کردار ادا کرنا اور ایک چھوٹے سے اسکول کو کئی تعلیمی اداروں اور ڈگری کالجوں میں تبدیل کر دینا کسی بھی طرح سرسید کے ایک اسکول کو یونیورسٹی میں تبدیل کر دینے سے کم نہیں ہے۔

۲۔سرسید نے جو اخبارات ورسائل جاری کئے ،ان کے لئے مالی تعاون دینے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔فاروق مضطر نے جو بھی کیا اسی کالج کی فیس سے پیسوں کو بچا کر کیا۔سرسید کے رسائل وجرائد جو بار بار بند ہوئے اور پھر جاری ہوئے ،وہ سب انگریز حکومت کی مہربانی تھی۔جب بھی انہوں نے نشر واشاعت کا عمل شروع کیا،ان کو مالی تعاون دینے والے موجود تھے۔اس کے علاوہ ان کے پاس ایسے رفقاء کی پوری ایک صف موجود تھی جو سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے میں پیش پیش تھے۔یہاں فاروق مضطر اپنے اہل خانہ یعنی والد اور بچوں کے ساتھ تنہا تھے، پھر بھی وہ اپنے خطہ پیر پنچال کی علاقائی سطح پر اسی طرح کامیاب ہوئے جس طرح سرسید ملکی سطح پر۔

۳۔سرسید اپنی یونیورسٹی میں یا اس سے قبل کہیں بھی کسی تقریب کا اہتمام کرتے تھے تو لوگ اس کا خرچ برداشت کرنے لئے موجود تھے یا وہ وسائل موجود تھے جن میں حکومتی سطح پر یونیورسٹی کے لئے ملنے والے بجٹ کی سہولت بھی تھی۔یہاں فاروق مضطر جو بھی پروگرام کرتے ہیں وہ خود کے ذاتی صرفہ سے انجام پاتا ہے۔اکیڈمی جیسے سرکاری ادارے کے اشتراک سے جو پروگرام ہوتے ہیں ،ان میں اکیڈمی کی مخصوص اور محدود جاری شدہ رقم ہوتی ہے اور فاروق مضطر کا اشتراک اس پروگرام میں اکیڈمی کے اضافی خرچ کو بانٹتا ہے نہ کہ اکیڈمی کے تعاون سے فاروق مضطر کے ادارے کا خرچ کم ہوتا ہے۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں اور فاروق مضطر کو خطہء پیر پنچال کا سرسید تسلیم کرنے کے سلسلے میں شواہد کے طور پر ایک لمبے عرصہ تک کی ان کی خدمات پر گفتگو کے لئے، کئی صفحات کا الگ مضمون درکار ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اتنے سے بھی کسی شک وشبہ کی گنجائش اب باقی نہ ہوگی کہ فاروق مضطر کو خطہ پیر پنچال کا سرسید کیوں تسلیم کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

Sahafat, Zaban aur Adab by Dr. Sayidah Bano (Asst. Prof. dept. of Urdu, MANUU Arts and Science College, Srinagar) cell-7780839924
ڈاکٹر سیدہ بانو (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، مانو، آرٹس اینڈ سائنس کالج، سری نگر)

صحافت، زبان اور ادب

لفظ جنرل (Journal) عربی لفظ ''صحیفہ'' کا مترادف ہے۔ اس کا استعمال مختلف معنوں میں کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ روزانہ معلومات کی کھتونی ہے جس میں سیر و سیاحت کی روزانہ تفصیل کا ریکارڈ درج ہوتا ہے یا سفر نامہ میں روداد بیان کی جاتی ہے۔ یومیہ لین دین کی تفصیل گوشوارہ کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ حالیہ واقعات، حادثات کا ذکر عوام کی دلچسپی کا سامان ہیں یا دلچسپ امور پر مشتمل ہو۔ ہم کہ سکتے ہیں کسی عوامی ادارہ کے ذریعے رکھی گئی روزانہ کارروائیوں کا رکارڈ جس میں عوامی واقعات یا کسی مخصوص حادثہ کے رونما ہونے کے بعد کی روز بروز کی تفصیل کے لیے یا کسی اخبار یا دیگر اشاعتی امور سے متعلق مواد پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ جب ہمارے ذہین میں سوال آتا ہے کہ صحافت کیا ہے؟ تو جواب ہے صحافت ''اطلاع'' کا نام ہے۔ یہ ابلاغ ہے۔ صحافت کا فن ایسا ہے کہ دن بھر کے واقعات کو چند الفاظ، آوازوں اور تصاویر میں ڈھال کر پیش کیا جانا گویا صحافت ''خبر'' ہے۔

مختلف علمائے ادب نے صحافت کی تعریف اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو قریب قریب سب ہی کا ماحصل ایک ہی ہے یعنی ابلاغ و ترسیل عامہ۔ معلوم ہوا صحافت سے مراد خبر، اطلاع اور خبر اطلاع سے متعلق مواد کا حصول، جمع کاری، ترتیب و تدوین، فیچر نگاری، تنقید و تبصرے نیز اخبار، رسالے، پمفلٹ، ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم یا کتاب کے وسیلے سے اشاعت اور اُس کی تقسیم ہے۔

صحافت، حیات انسانی کے مختلف شعبوں میں ہونے والے واقعات و حادثات اور حالات سے راست جانکاری کا نام ہے۔ یہ جہاں انسان کو ہر سمت سے باخبر اور آگاہ رہنے کی ضرورت پورا کرتی ہے۔ وہیں اس کی ذہنی تربیت اور شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ زلیب فہمی، روشن خیالی، کشادہ قلبی اور بالخصوص درون بینی پیدا کرنے میں صحافت کے کردار سے انکار ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ شعور بیداری، جمہوری اور اصلاحی نظام کا قیام اور استحکام بھی صحافت کا منصب ہے۔ صحافت

کا عمومی تصور ابتدا تا حال ''اخبار'' یا ''خبر نامہ'' کا ہی رہا ہے یعنی صحافت کا جز و اعظم ''خبر'' ہی ہے اور اخبار میں شائع ہونے والے تمام ترغیبی مواد و مرکز میں ''خبر'' ہی ہوتی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر فرماتے ہیں:

''اخبار کا جز و اعظم جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اپنے ملک کی سے باہر کی عالمی خبریں ہونی چاہئے اور روزانہ نکلنے والے اخباروں کا مقصد ہی یہ ہونا چاہئے اور درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے خریداروں تک دنیا کے تازہ ترین واقعات اور حالات کی خبریں جلد سے جلد پہنچایا کریں۔''

(بشمولہ: اردو ڈائجسٹ 'ہما' جوہر نمبر)

(اداریہ ''ہمدرد'' دہلی یکم مئی ۲۹۱۷ء جنوری ۵۸۹۱ ص ۹۱)

لیکن جب ہم صحافت کے فن پر غور کرتے ہیں تو یہ نتیجہ برآور ہوتا ہے کہ ''صحافت'' نثری صنف ہے جو افسانوی ادب کے زمرہ میں نہیں آتی بلکہ ''صحافت'' غیر افسانوی ادب کی ایک صنف ہے۔ زبان و ادب، کے تنقید نگاروں نے بھی غیر افسانوی ادب کی ایک صنف قرار دیا ہے۔ بعض ناقدین ادب نے صحافت اور ادب میں ایک قدم کی دوری بتائی ہے۔ وزیر آغا فرماتے ہیں:

''بحیثیت مجموعی ادب کسی زمانے کے میلانات و رجحانات کی عکاسی کرتا ہے اور صحافت خارجی واقعات اور ہنگامی حالات کی خبر گیری۔ اس لیے ادب کی حیثیت مستقل ہوتی ہے اور صحافت کی ہنگامی۔''

(اردو میں کالم نویسی کا فن اور صورت حال'' (آزادی سے قبل) خالد محمود، ص، 206)

مشمولہ ''اردو صحافت ماضی اور حال،'' مرتبین خالد محمود و سرور الہدیٰ، مکتبہ جامعہ دہلی)

ساختیات کے حوالے سے غور کریں تو افسانوی ادب خارجی ضرورتوں سے ماورا ہوتا ہے۔ افسانوی ادب کے برخلاف سب ہی نثری اصناف چاہے مضمون، سوانح، خودنوشت، سفرنامہ، خطوط، خاکہ، انشائیہ اور رپورتاژ وغیرہ میں واقعہ کی اہمیت ہوتی ہے یعنی جس کا خارجی وجود ہو تب ہی کسی بھی نثری صنف میں معرض وجود میں آتا ہے لیکن افسانوی ادب مثلاً داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ کے مصنفین سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا جاتا کہ وہ قاری کو خارجی مصداق دکھائے متذکرہ تمام اصناف میں خیالی دنیاؤں کی سیر کے علاوہ گرد و پیش کی زندگی کا عکس دیکھتے ہیں۔

معلوم ہوا تخلیق ادب سچائی اور کسی حادثہ یا واقعہ کا تخلیقی اظہار ہے جس کی ایک تخیلی دنیا بھی ہے اس میں فکر و جذبات کا بیان ہوتا ہے یعنی حقیقت اور تخیل کے بہترین امتزاج کے خوب صورت

اظہار کا نام ادب ہے۔صحافت روزمرہ کے حادثات، واقعات اور دیگر تلازمات کا منظری اظہار ہے جس میں روز شب کے حادثات اور واقعات کی ایک کھتونی تیار کی جاتی ہے۔رشید حسن خاں ادب اور صحافت میں فرق کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ادب اور صحافت کے مابین فرق کرنے کے لیے موضوع اصل چیز نہیں، اصل چیز ہے لکھنے والے کا انداز وفکر اور فرز عمل۔یہی چیز ادب کو صحافت سے ممتاز وممیز کرتی ہیں اور تحریر میں تہہ داری، بلندی اور سنجیدگی پیدا کرتی ہیں''۔

صحافت اپنے عہد اور اس کی معاشرت کا آئینہ ہوتی ہے۔عہد بہ عہد معاشرتی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کا پرتو ہمیں اس عہد کی صحافت پر واضح نظر آتا ہے۔ماضی میں صحافت کا مفہوم اور دائرہ کار اس وقت کے حالات کے مطابق ایک خاص حد تک ہی محدود تھا۔حب الوطنی، جذبۂ حریت ماضی کی صحافت کا اہم حصہ تھے۔فی زمانہ صحافت ایک فرض شناس رہنما کی حیثیت سے فلاح انسانی میں ہمہ وقت مصروف ہے۔اسی لیے انسانی زندگی سے متعلق تمام تر موضوعات ومسائل جیسے سیاست ومعاشرت، معیشت وتجارت، تہذیب وثقافت، مذہب وادب وغیرہ واسطہ یا بالواسطہ اخبار کے حدیقے کا حصہ ہوتے ہیں۔اسی لیے ڈاکٹر شیخ فرید نے صحافت کی ذمہ داریوں کا بیان اس طرح کیا ہے:

''صحافت اگر حق وعدل، خیر وفلاح کے لیے کام کرے تو انسانیت کے لیے مفید قوت ہے۔وہ حاکم اور محکوم کے درمیان ایک رابطہ ہے عوام اور خواص کے درمیان ایک رشتہ ہے۔رائے عامہ کو ہموار کرنے کا موثر ادارہ ہے۔صحافت معاشرتی، عمرانی اور سیاسی آرا پر اثر انداز ہوتی ہے۔ان کو بناتی اور بدلتی ہے۔آزادی رائے کی تبلیغ واشاعت میں ممد ومعاون ہوتی ہے''۔

(اردو صحافت اور تحریک آزادی''ص،68)

کائنات اور زندگی تحریک سے عبارت ہے۔ہر پل حادثات اور واقعات رونما ہوتے ہیں اور یہ واقعات اس کے وجود کے مقاصد کو ایک نئی معنویت عطا کرتے ہیں اور کرۂ ارض پر انسانی زندگی کی بقا کی تفہیم کو ایک نئی بصیرت سے روشناس کراتے ہیں۔قدرت نے ہر انسان میں تلاش وجستجو کا مادہ رکھا ہے چونکہ انسان کو قوت فہم وادراک عطا کی گئی ہے لہٰذا کچھ نیا جاننے کی یہ آرزو اُسے ہر دم نئے آفاق کی تلاش میں مصروف رکھتی ہے اور تمام ایجادات بھی اسی جذبۂ تجسس کی دین ہیں۔پرانے زمانے میں خبر رسانی کا کام طیور، تیز رفتار گھوڑوں اور چاک وچوبند ہرکاروں سے لیا جاتا تھا۔جب

ریاستیں وجود میں آئیں اور سیاسی نظام قائم ہوا تو خبر رسائی مخبروں کی وساطت سے کی گئی اور اس طرح خفیہ محکمے قائم ہوئے۔ صنعتی انقلاب کے بعد آلات طباعت ایجاد ہوئے اور خبر رسائی ایک فن میں تبدیل ہوگئی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اخبار اور رسائل میں چھپنے والے مواد کی تیاری کا نام صحافت ہے۔

کسی بھی زبان کے اخبار کی زبان کیسی ہونی چاہئے؟ اس کے لوازمات کیا ہونے چاہیے؟ اس کے تقاضے کیا ہونے چاہئے؟ مذکورہ سوالات کے جوابات کی تلاش اس لیے ضروری ہے کہ خبر نگاری کا وسیع معالعہ، اسے زبان و بیان پر کامل دسترس اور عبور حاصل کرنے میں مدد کرتا ہے کیوں کہ اخبار نویسی کا مرکزی نکتہ خبر نگاری ہے۔

زبان و بیان پر مہارت اس لیے لازمی ہے کہ اس سے خبر نگاری کی قوت اظہار میں اضافے کا امکان بڑھتا ہے۔ خبر نگار کو زبان پر مکمل مہارت حاصل ہونی چاہیے۔ خبر نگار کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سماج کی برق رفتاری کے نتیجہ میں جنم لینے والے نئے الفاظ اور نئی اصلاحات سے بھی اپنے ذخیرہ الفاظ میں مسلسل اضافہ کرتا رہے کیوں کہ خبر نگار کی کامیابی کا انحصار جتنا خبروں کی تفصیل معتبر ہونے پر ہے، اتنا ہی اُن تفصیلات کو موثر اور دلچسپ پیرایۂ اظہار میں قاری تک پہنچانے پر بھی ہوتا ہے۔ مقفیٰ، مسجع ضائع بدائع سے آراستہ تخلیق و شاعرانہ نثر کی جگہ سادہ سلیس اور رواں دواں بیانیہ خبر کے حسن و تاثیر میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ اسی لیے سید احمد قادری نے اخبار کی زبان پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''آسان لفظ کو دقیق لفظ پر ترجیح دی جائے۔ عام فہم الفاظ سے احتراز بہت ضروری ہے۔ اخباری زبان ہر لحاظ سے قابل فہم ہو۔ مروج اصطلاحات ہی جو جگہ دی جائے الفاظ تیز یا روکھے نہ ہوں، جملے بھی مختصر ہوں، جملوں کی ساخت میں پھرتیلا پن دکھلایا جائے انگریزی الفاظ یا غیر معروف نام اور ذو معنی الفاظ لکھتے وقت زیر، زبر پیش کے استعمال سے الفاظ کو وضاحت بخشی جائے۔''

(''رہبر اخبار نویسی''ص،270)

خبر نگاری کی زبان کے مزاج، الفاظ اور اُن کے مناسب محل استعمال سے عدم واقفیت، نیز ، بادی قواعد زبان سے لاعلمی کے نتیجہ میں زبان و بیان کی غلطیاں اکثر خبر نگاری کی ناکامی کا سبب ہوتی ہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ مقفیٰ جملوں، سجی ہوئی عبارت اور دقیق الفاظ سے ہی تحریر میں جان ڈالی جاسکتی ہے بلکہ اس طریقہ اظہار سے الگ ہٹ کر بھی زبان میں شیرینی، روانی اور شگفتگی پیدا کی

جاسکتی ہے۔سچائی یہ ہے کہ سادگی میں حسن پیدا کرنا ہی دراصل زبان کا تقاضا ہے۔

جدید دور میں ریڈیو، ٹی وی، انٹرنیٹ صحافت ترسیلی دنیا کے ذرائع ہیں۔ جیسا ذکر کیا جاچکا ہے کہ اخبارات بھی صحافت نگاری کا ایک سب سے پہلا موثر ذریعہ ہے۔ان کے ذریعے ہمیں خبریں ملتی ہیں اور بیشتر ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے زندگی کے تمام تر شعبوں کے بارے میں جانکاری حاصل ہوتی ہے جمہوری نظام میں میڈیا چوتھا ستون خیال کیا جاتا ہے کیوں کہ اُس سے رائے عامہ ہموار ہوتی ہے اور دوسروں کو متاثر کرنے کا ایک ذریعہ بھی خیال کیا جاتا ہے۔

ترسیل وابلاغ کے لیے زبان کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔ زبان اظہار خیال کا ایک موثر ذریعہ ہے جیسی زبان ہوگی ویسے اثرات عوام کے دلوں پر قائم ہوں گے۔زبان میں ادبی اور غیر ادبی دونوں طرح کی تحریریں شامل ہیں۔غیر ادبی زبان کے زمرے میں عام طور سے اخبارات آتے ہیں کیونکہ اخبار میں زبان کا ادبی ملحوظ خاطر نہیں رکھا جاتا۔

ادب اور صحافت میں زبان کے فرق کے علاوہ اس کے موضوعات بھی ہیں ادبی نگارشات میں نثر نگار اپنے خیالات،نظریات اور احساسات کو تخلیقی انداز میں پیش کرتا ہے جب کہ صحافت میں ایک صحافی اپنے گردوپیش میں ہونے والے واقعات کی اخباری زبان میں فوراً اطلاع دیتا ہے کہ فلاں جگہ،فلاں وقت یہ واقعہ رونما ہوا۔ یہاں مقام اور وقت کو دکھانا بھی شرط ہے ادب میں وقت کی کوئی قید نہیں۔اس کے برعکس صحافت میں صحافی کو ہمیشہ وقت کا خیال رکھنا ہوتا ہے جائے حادثہ کی بھی تفصیل بناتی ہوتی ہے۔آج جو واقعہ ہوا ہے صحافت میں کل تک اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اس لیے صحافی کو وقت کے ساتھ ساتھ چلنا ہوتا ہے۔آج تیز رفتار زندگی ہے۔

ہر لمحہ کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہوتا رہتا ہے۔جس کی اہمیت آج ہے کل اس واقعہ کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی اور نہ ہی قارئین اور عوام کی دلچسپی کا سبب بنے گی۔ چونکہ اس امکانی کائنات میں ہر لمحہ واقعات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔اس لیے خال میں ہوئے واقعہ کی اخبار میں اہمیت ہوتی ہے۔ جبکہ ادب میں کسی بھی زمانہ کا واقعہ کسی بھی زمانے میں بیان ہوسکتا ہے اس کے لیے وقت کی کوئی قید نہیں بلکہ ادبی شہ پارہ زمانی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ادب اور صحافت کے فرق کو بہتر طور سے وزیر آغا نے وضاحت کی ہے:

''بحیثیت مجموعی ادب کسی زمانے کے خارجی حالات وواقعات کی بہ نسبت اس زمانے کے میلانات ورجحانات کی عکاسی کرتا ہے چنانچہ ایک تاریخی جائزہ ایک ادب پارے سے اس حد تک مختلف ہے کہ

جہاں مقدم الذکر کا دائرہ عمل واقعات کی ترتیب وتدوین تک محدود ہے وہاں ادب ان احساسات وجذبات کی ترجمانی کرتا ہے جو ایک خاص زمانے کی پیداوار ہوتے ہیں اور جن کے باعث اجتماعی ملکی شعور ایک حد تک مرتب ہوتا ہے۔ ادب کی حیثیت مستقل ہے اور صحافت کی حیثیت محض ہنگامی۔ لیکن ادب اور صحافت کا فرق مواد اور موضوع تک محدود نہیں دراصل اس کا نمایاں فرق وہ طریق اظہار ہے جو ادب کو ادب اور صحافت کو صحافت کا درجہ عطا کرتا ہے''۔

(اردو ادب میں مزاح''صفحہ 309،310)

صحافت کے لغوی معنی نامہ نگار کے ہیں۔ صحیفہ کا مطلب ''رسالہ یا کتاب'' ہے انبیاء کرام پر آسمان سے اترے صحائب الٰہیہ وکتب الٰہیہ اسی نام سے موسوم ہیں صحیفہ کتاب کی مختصر صورت کو کہتے ہیں۔ صحیفہ میں شائع شدہ یا درج مواد کو بھی کہتے ہیں جس کا مقصد اصلاح معاشرہ اور انسانوں کو معلومات فراہم کرانا ہے جس طرح صحائف اور کتب الٰہیہ وقتاً فوقتاً حالات کی ضرور کے مطابق اترے ہیں اسی طرح مواد مقررہ وقفوں میں شائع ہوتا ہے۔

لفظ صحیفہ انگریزی لفظ Journal ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ صحافت میں عوام کے خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے عوامی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنا صحافت کا کام ہے آزادی اور غیر جانبداری اس کے بنیادی اوصاف ہیں۔ رائے عامہ کی تشکیل، عوام کی ترجمانی، قومی شعور کی بیداری۔ سیاسی شعور کی تعمیر، جمہوری نظام کا استحکام، معلومات فراہم کرنا، عوام اور حکومت کے درمیان رابطہ قائم کرانا۔ حکمرانوں کے غلط طرز عمل کا احتساب، وغیرہ صحافت کی صفات اور ذمہ داریاں ہیں اس لیے صحافت کو ریاست کے چوتھے ستون کا درجہ حاصل ہے۔

دنیا کے بیشتر ممالک میں حکومتیں صحافت کے زیر اثر رہتی ہیں۔ خصوصی طور سے جن ممالک میں جمہوری نظام قائم ہے بقول میتھو آرنلڈ صحافت عجلت میں لکھا گیا ادب ہے۔ اخبار اور مجلّہ میں فرق یہ ہے کہ اخبار خبروں کا خزینہ ہے جبکہ مجلہ، رسالہ، جریدہ علمی، ادبی سائنسی، تہذیبی اور دیگر مضامین کا مجموعہ ہے۔ حالانکہ اخبار میں بھی مضامین ہوتے ہیں لیکن اس میں عام طور سے عارضی موضوعات زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ یہ موضوعات وقتی اور ہنگامی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ صحافی ہنگامی موضوعات کو غیر جانبداری سے بیان کرتا ہے۔ ادب میں حقیقت کو داخلی اور تخلیقی سطح پر پیش کی جاتی ہے جبکہ صحافت میں حقیقت کو واقعاتی سطح پر بیان کی جاتی ہے۔

مختصر طور سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ صحافت ایک فن بھی ہے جس کے ذریعے واقعات کی ترسیل

کا کام لیا جاتا ہے اور واقعات کو ایک مخصوص اور جامع انداز میں عوام تک پہنچایا جاتا ہے دوسرے نثر سے افسانوی تحریر کا انداز نکال دیا جائے تو پھر وہ ادبی صنف نہ رہ کر صحافت نگاری بن جائے گی گویا صحافت کی افسانوی ہوتی ہے اس کا بیانیہ نرمی حقیقت نگاری ہوتی ہے۔

☆☆☆

اعلیٰ ہستی: اسلامی اور صوفی نقطہ نظر سے

Islamic and Sufi perspective of Supreme Being by
Ujala Amin, Senior Research Fellow, Department of Islamic Studies, Baba Ghulam Shah Badshah University Kashmir&Rajouri, Jammu,((BGSBU
Dr. Naseem Gul, Assistant Professor, Department of Islamic Studies, Baba Ghulam Shah Badshah University Kashmir&Rajouri, Jammu,((BGSBU
اجالا امین (سینیر ریسرچ فیلو، ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری، جموں وکشمیر)
ڈاکٹر نسیم گل (اسسٹنٹ پروفیسر، ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری، جموں وکشمیر)

Abstract

Concept of Supreme Being is ingrained in the very conscience of man from the very outset. Whatthe Qur'an does is that it only reminds this concept. However, man gets convinced for this on hisown decision. Actually, the helplessness and vulnerability of man against the vast Nature hasalways persuaded him for a Being to rely upon and seek sustenance and support from. Althoughcalled as by psychologists but given the fact that man is''fear factor almost an insignificantcreature when compared with the of((like manmajestic Universe, the fact is that a being

suchgreat intellectual faculties large enough to discover and disclose the secrets of nature isrendered meaningless if it is not attached to, in one way or the other, with the Supreme. However, in quest for the truth of the Supreme the struggle of every human being has differedfrom the other. Certain individuals, in every age, have been very sensitive for this purpose. Alsoit is because of this difference in the sensitivity for the Truth that some stopped just afterrecognizing the Supreme, while as others, after recognition were satisfied only after worshippingand cherishing the Supreme. The best examples of the latter stock, besides others, were thesensitive people, although a few, of pre-Qur'anic Arabia who were called Hunafa. They were alltruth seekers. Confining themselves to : andsay((Godsolitary places, they would remember Allah O Allah if we had known how to worship You, we would'' As such, the concept of''have worshipped Youaccordingly. such kind of a Being is but a necessary prerequisite ofmans being a special creature in the universe. And for such a concept of the Supreme Being, HisEssence, His Attributes, relationship of His Essence with His Attributes, relationship of SupremeBeing with His creation, certain theories were put forward by Sufis. Moreover, this concept hadits lace not only among the religionists or philosophers but also among Yogis, Monks, and Sufis.

خلاصہ:

اعلیٰ ہستی کا تصور انسان کے ضمیر میں شروع ہی سے رہا ہے۔ قرآن جو کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ صرف اس تصور کو یاد دلاتا ہے۔ تاہم انسان اپنے فیصلے پر اس کے لیے قائل ہو جاتا ہے۔ درحقیقت قدرت کی وسعت کے مقابلے میں انسان کی بے بسی اور کمزوری نے اسے ہمیشہ ایک ہستی پر بھروسہ کرنے اور اس سے رزق اور سہارا حاصل کرنے پر آمادہ کیا ہے۔

اگرچہ ماہرین نفسیات نے اسے ''ڈرفیکٹر'' کہا ہے لیکن اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے کہ جب عظیم کائنات کے مقابلے میں انسان تقریباً ایک معمولی مخلوق ہے، حقیقت یہ ہے کہ اتنی بڑی فکری صلاحیتوں کا ایک وجود (انسان جیسا) رازوں کو دریافت کرنے اور افشا کرنے کے لیے کافی ہے۔ فطرت کو بے معنی قرار دے دیا جاتا ہے اگر وہ کسی نہ کسی طرح تصور الٰہی کے ساتھ منسلک نہ ہو۔

تاہم، تصور الٰہی کی سچائی کی تلاش میں ہر انسان کی جدوجہد دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر دور میں بعض افراد اس مقصد کے لیے بہت حساس رہے ہیں۔ نیز حق کے لیے حساسیت میں اس فرق کی وجہ سے کچھ لوگ الٰہ کو پہچاننے کے بعد ہی رک گئے، جب کہ کچھ لوگ تسلیم کرنے کے بعد صرف اس کی عبادت اور تعظیم کے بعد ہی مطمئن ہوئے۔

مؤخر الذکر کی بہترین مثالیں، دوسروں کے علاوہ، حساس لوگ تھے، اگرچہ چند ایک، قبل از قرآن عرب کے تھے جنہیں حنیف کہا جاتا تھا۔ وہ سب سچائی کے متلاشی تھے۔ تنہائی کی جگہوں تک محدود ہو کر وہ اللہ کو یاد کرتے اور کہتے: اے اللہ اگر ہمیں تیری عبادت کرنا معلوم ہوتا تو ہم اسی کے مطابق تیری عبادت کرتے۔ اس طرح، اس قسم کی ہستی کا تصور انسان کے کائنات میں ایک خاص مخلوق ہونے کی ایک لازمی شرط ہیا اور اس طرح کے تصور کے لیے وجودِ باری، اس کی ذات، اس کی صفات، اس کی ذات کا اس کی صفات سے تعلق، اس کی مخلوق کے ساتھ اعلیٰ ہستی کا تعلق، صوفیاء نے کچھ نظریات پیش کیے تھے۔ مزید یہ کہ یہ تصور نہ صرف مذہب پرستوں یا فلسفیوں میں بلکہ یوگیوں، راہبوں اور صوفیاء میں بھی اپنا مقام رکھتا تھا۔

کلیدی الفاظ: اعلیٰ ہستی، وجودِ باری، تصوف، اسلام، روحانیت۔

تعارف:

انسان کے باطن کا ثبوت: جہاں تک انسان کے آئین کا تعلق ہے، چاہے وہ جسمانی ہو، روحانی

ہو یا فکری، اس نے ہمیشہ نہ صرف ایک جھکاؤ ظاہر کیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ یا اعلیٰ ہستی کے لیے ایک عظیم وابستگی بھی ظاہر کی ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ انسان کا 'باطن' خود کو اعلیٰ ہستی سے تعلق کے بغیر بے چین اور بے معنی پاتا ہے۔ یہ اعلیٰ ہستی سے منسلک اور منسلک ہونے سے سکون پاتا ہے جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کے محض ذکر (نظر) سے متوجہ ہوتا ہے۔ یا یہ بالکل پیاسے کی طرح ہے جو پانی سے اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ اسے پانی کے معیار کے بارے میں وضاحت اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے (خواہ اس سے پیاس بجھے گی یا نہیں)۔ اسی طرح انسان کا باطن بھی اعلیٰ ہستی یا اللہ کی چوکھٹ پر پہنچتے ہی سکون واطمینان حاصل کر لیتا ہے۔ اس حقیقت کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

''یہ شعور انسان کو پیدائشی علم کی صورت میں عطا کیا گیا ہے۔ اس طرح، ہر انسانی روح، پیدائش کے وقت، ایک عبد اور ایک مسلمان (خدا کا فرمانبردار) اور حنیف (جو باطل سے منہ موڑ کر صرف خدا کی طرف لوٹتا ہے) کے طور پر پیدا ہوتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے قرآن نے فطرت اللہ (خدا کا دین) قرار دیا ہے جس پر انسان کی تخلیق کی گئی ہے۔''

انسان کے باطن کی طرف سے فراہم کردہ شواہد کا تاریخی تسلسل:

اگرچہ بعض علماء کی طرف سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ اعلیٰ ہستی کا تصور اس قدرتی مظاہر کے بارے میں انسان کے 'ڈر کمپلیکس' کی تخلیق کے سوا کچھ نہیں ہے جس کے سامنے وہ خود کو بالکل بے بس پاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بنی نوع انسان اعلیٰ ہستی کے شعور سے عاری ہو۔ اگر معاملہ وہی ہوتا جیسا کہ ان علماء نے تجویز کیا ہے تو ہمیں اس وقت کے اس خاص مقام کا علم ہونا چاہیے جب یہ تصور انسان کے ضمیر میں پیدا ہوا تھا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ انسان، نسل در نسل، اس تصور سے اسی طرح آشنا ہوتا گیا جس طرح ایک آدمی اپنے والدین کے بارے میں آہستہ آہستہ، تسلسل کے ساتھ واقف ہوتا ہے۔

اسی تسلسل کی وجہ سے انسان جب بھی گمراہ ہوتا ہے آسانی سے اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ خدا خود قائم ہے۔ اسے اپنے وجود کے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ خدا کے خود ظاہر ہونے کی وجہ دوگنا ہے۔ اولاً یہ کہ کائنات کا وجود خود خدا کے وجود کی دلیل ہے۔ دوسرے یہ کہ انسان کا وجود بذاتِ خود خدا کے وجود کی دلیل ہے۔ اس لیے انسان خدا پر یقین رکھتا ہے، کیونکہ وہ اس پر یقین کرنے کا پابند ہے۔ اس طرح یہ تصور باہر سے مستعار نہیں لیا گیا بلکہ یہ آدمی کے اندر کی آواز ہے۔

انسان کی عقل کا ثبوت: انسان نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اپنے ضمیر کو آزمایا ہے، جس کی تائید تاریخی تسلسل سے ہوئی، اپنی فکری فیکلٹی کے استعمال سے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کا ''باطن'' اعلیٰ ہستی کے تصور سے کم کسی چیز سے سکون اور اطمینان حاصل کرتا ہے، لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس نے ہمیشہ اس ثبوت کو اپنی ذہنی صلاحیتوں سے جانچنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ فطرت کی مختلف قوتوں، ان کی ساخت، ان کے افعال، ان کے باہمی ربط، ایک دوسرے کے لیے عام طور پر اور انسان کے لیے خاص طور پر ان کی افادیت کا تجزیہ کرتا ہے۔ اس سب میں وہ ایک ڈیزائن اور ایک مقصد دیکھتا ہے۔ قرآن نے بارہا ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جن میں انسان کی عقل اسے اللہ کی طرف لے جاتی ہے۔ مثال کے طور پر:

''اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی دکھائی تاکہ وہ پختہ ایمان والے بن جائیں۔ جب رات نے اس پر سایہ کیا تو اسے ایک ستارہ نظر آیا۔ اس نے کہا: یہ میرا رب ہے۔ لیکن جب وہ ڈوب گیا تو اس نے کہا: 'میں ڈوبنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ پھر جب چاند کو طلوع ہوتے دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے، لیکن جب وہ ڈوب گیا تو کہا: جب تک میرا رب میری رہنمائی نہ کرے تو میں ضرور گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا۔ پھر جب سورج کو طلوع ہوتے دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے۔'' پھر جب وہ ڈوب گیا تو فرمایا: ''اے میری قوم! بے شک میں اللہ کے ساتھ شرک کرنے سے بھری ہوں۔''

اس طرح انسان صرف یہ اندازہ لگاتا ہے کہ ڈیزائن اور مقصد (فطرت) کے پیچھے طاقت صرف سپریم ڈیزائنر یا صرف اللہ ہے۔ اس طرح عقل اللہ کی گواہی دیتی ہے۔ اللہ کے انبیاء کی **شہادت:** تاریخ میں درج ہے کہ انسانوں میں سے مخصوص ادوار میں اہم اور خاص (اللہ کے برگزیدہ) آدمی پیدا ہوئے جنہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ انہیں اللہ نے لوگوں کو اپنی طرف بلانے کے لیے منتخب کیا ہے کیونکہ بعد والے دین سے دور جا چکے تھے اور گمراہ ہو چکے تھے۔ یہ دعوت، حقیقی اس لیے ہوتی تھی کہ یہ انسان کے ''نفس باطن'' کی آواز اور پسندیدگی سے میل کھاتی تھی، اللہ کی شہادت کے تاریخی تسلسل کے مطابق تھی اور انسان کی عقل کے فیصلے کے مطابق بھی تھی۔ اس طرح خدا نے انسان کو اپنے اوپر اکیلا نہیں چھوڑا۔ بلکہ، اس نے اپنی رضائے الٰہی کے نزول کے ذریعے اس کی مدد کی اور رہنمائی کی تاکہ اسے اس کی راحت کی یاد دلائیں۔ خدا نے اپنی مرضی انبیاء یا رسولوں کے ذریعے ظاہر کی جنہوں نے لوگوں کو دین الفطر کی طرف بلایا۔ انبیاء نے بنی نوع انسان کو اس کے عمل کے نمونے بھی

فراہم کیے ہیں۔انہوں نے بنی نوع انسان کو دینِ فطرت کے انحراف سے نجات دلائی اور اسے اس طرح کے انحراف کے سنگین نتائج سے خبردار کیا۔کچھ لوگوں نے انبیاء کی تعلیمات کی پیروی کی اور دینِ فطرت کی طرف لوٹ گئے۔مزید یہ کہ یہ ہستیاں جو کہ انبیاء کہلاتی ہیں ہر لحاظ سے سب سے زیادہ قابل اعتماد تھے اور ان خصوصی اور برگزیدہ آدمیوں کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ انہوں نے ہمیشہ وہی حقیقت سامنے لائی جو اللہ کی حقیقت ہے۔الٰہی مداخلت کے شواہد، جو پوری تاریخ میں مختلف مواقع پر گواہ ہیں:

اللہ کے نبیوں کے ذریعے بنی نوع انسان کو جو حق پہنچایا گیا وہ دراصل انسانی فطرت کی آواز اور پکار تھی۔یہ سچائی کہ انسان کا ''باطنی نفس'' اعلیٰ ہستی کو پسند کرتا ہے، سمجھ سے باہر نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دن ہی آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے سامنے اپنی ذات کو ظاہر کر دیا تھا اور پوری انسانیت نے اللہ کو اپنا رب مان لیا تھا۔اس سلسلے میں قرآن کہتا ہے:

''جب تیرے رب نے بنی آدم سے ان کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور انہیں اپنے بارے میں گواہی دی (کہا) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں (جو تمہیں پالتا ہے)؟! ہم گواہی دیتے ہیں!" (یہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ تم روزِ حشر یہ کہو: ''ہم نے کبھی اس کا خیال نہیں رکھا۔''

یہی شعور اور تصور انسان کی نفسیات میں نسل در نسل منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔اور اس تصور کی تخلیقِ نو اور دوبارہ فعالی کے لیے اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً اپنے انبیاء (ع) کو بھیجا۔تاہم، زیادہ تر ایسا ہوا کہ لوگوں نے ان کی دعوت و تبلیغ کو مسترد کر دیا۔چونکہ لوگوں کا یہ رویہ ان کے باطن کی آواز، اللہ کے تصور کے تاریخی تسلسل، انسان کی اپنی عقل کے فیصلے اور انبیاء علیہم السلام کی جدوجہد کے خلاف تھا، اس لیے انسان کو مداخلتِ الٰہی کے ذریعے صحیح راستے پر لایا گیا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی طرف سے کسی بھی عذر کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا جس کا اندازہ مذکورہ بالا آیت کے آخری حصے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔اس طرح اللہ کا حکم اس آیت کے مفہوم کے مطابق باقی رہ گیا۔

کسی فرد کے لیے یہ کہنے کے لیے کوئی عذر نہیں ہے، یا تو (۱) کہ وہ بے خبر تھا، یا (۲) کہ اسے اس کے باپ دادا کے گناہوں کی سزا نہیں ملنی چاہیے، کیونکہ اس کی سزا (اگر کوئی ہے) اس کی ذاتی ذمہ داری سے آتی ہے اور اس کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ ایمان سے یا تو منحرف ہو جائے یا پھر اس کی روحانیت کے اندر تنزل ہو۔چونکہ انسان کے عذر کا ہر موقع ختم ہو چکا تھا، اس لیے مختلف مواقع پر اللہ تعالیٰ نے فاسقوں کو سزا دینے کے لیے براہ راست مداخلت کی۔مثال کے طور پر، نوح کی قوم

جہاں بڑے طوفان کی زد میں آئی، فرعون کی قیادت میں مصری جہاں سمندر میں ڈوب گئے۔ اسی طرح ہود (عاد)، صالح (ثمود) اور لوط کی قوموں کو بھی اللہ نے اپنی گرفت میں لیا۔ تاہم، حتمی براہ راست مداخلت مختلف اور عجیب تھی۔ اس بار کسی بھی قدرتی واقعہ نے ان لوگوں کو تباہ نہیں کیا جنہوں نے آخری نبی کی دعوت کو رد کیا۔ یہ پیغمبر (ص) اور آپ کے اصحاب کے دست و بازو سے تھا جس نے باطل کے لشکر کو شکست دی۔ یہی نہیں بلکہ ''بے خدا'' کے تصور کو پہلے مرحلے میں حجاز کی سطح سے نظریاتی طور پر مٹا دیا گیا تھا اور دوسرے مرحلے میں خلافت راشدہ کے ذریعے اسے زمین کی سطح سے بالکل دھل دیا گیا تھا۔ اس طرح قرآنی آیت کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے:

''کیا اللہ نے انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے کے ذریعے سے تبدیل نہیں کیا، یقیناً اگر ایسا نہ کرتا تو وہاں خانقاہیں، گرجا گھر، عبادت گاہیں اور مسجدیں گرا دی جاتیں جن میں اللہ کا نام بکثرت یاد کیا جاتا ہے۔''

کیونکہ اس میں شامل اصول تمام عبادات کا تھا، یہودی یا عیسائی نیز مسلمان، اور تمام بنیادوں کا جو تقویٰ کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس طرح، یہ الٰہی مداخلتیں تھیں مگر آخری الٰہی مداخلت کا تعارف جو اللہ کی طرف سے قیامت کے دن ہوگا۔ لہٰذا، اگر قیامت کے دن سے موازنہ کیا جائے تو پوری انسانی تاریخ میں دیکھی جانے والی خدائی مداخلتوں کو ''قیامتِ صغریٰ'' کہا جا سکتا ہے، جس میں لوگوں کو وہی کچھ دیا گیا جو ان کے ہاتھوں نے انجام دیا تھا۔ تاہم قیامت (قیامتِ کبریٰ) کے دن مکمل انصاف کی گواہی دی جائے گی۔

بنی نوع انسان نے اس شعور کو کئی طریقوں سے اسمِ ذات کا نام دے کر، اللہ تعالیٰ کا بنیادی احساس دلایا ہے۔ لفظ اللہ' تمام مسلمان بشمول غیر عرب بھی خدا کے نام کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ زیادہ تر عربی بولنے والے غیر مسلم بھی یہ لفظ خدا کے نام کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اللہ' عربی میں سب کے خدا، واحد اور واحد خدا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں لفظ اللہ' کی کوئی جمع شکل نہیں ہے اور اس نام کی تمثیل ہمیں دنیا کی مختلف زبانوں اور مذاہب کے اندر ملتی ہے۔ اسلام کے مطابق، اللہ ہی واحد خالق اور پالنے والا اور تمام مخلوقات کا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ اکیلا ہی حقیقی معنوں میں ایک ہے، نہ کوئی اس سے جنا ہے اور نہ ہی وہ کسی سے جنا گیا۔ آخرت کے دن وہ تمام انسانوں کا ان کے ایمان اور عمل کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ وہ ہر چیز کو دیکھنے والا، جاننے والا اور سننے والا ہے۔ اللہ غالب اور قدرت والا ہے۔ ہمدردی، احسان اور رحم اس کی

صفات ہیں۔عربی میں اللہ کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اسلام ہے۔

تصوف :تصوف عربی زبان کا ایک لفظ ہے، یہ دلکش بلکہ ایک الجھن پیدا کرنے والا حرف ہے۔اس کی سحر انگیزی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے دنیا کے بڑے بڑے دانشوروں کو اپنی طرف مائل کیا تھا اور لوگوں کے ذہنوں پر گہرا نقش ڈالا تھا۔تمام علوم جن کو ہم تصوف کہتے ہیں اگر ایک دائرے سے موازنہ کیا جائے تو اس کا قطب شمالی انتہائی فلسفیانہ پیچیدگیاں ہوں گے اور اس کا قطب جنوبی توہم پرستی کی گھٹیا ترین شکل ہوگی۔عام لوگوں کے لیے تصوف کا مطلب ہے محبت رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔یہی وجہ ہے کہ وہ صوفیوں کے آگے سرنگوں ہیں۔اسلام نے اللہ تعالیٰ کے کلام (کلام اللہ) کو فوقیت دی ہے۔

یہ عقیدہ کہ دنیا اپنی فطرت میں برائی ہے اسلام نے اس سے کنارہ کشی کی ہے۔انسان فطرتاً برا نہیں ہے بلکہ فطرت کے اعتبار سے انسانی زندگی خوبی ہے اور اس قوت کو صحیح سمت میں ڈھالنے کا نام اسلام ہے۔اپنی خواہشات کو یا تو مراقبہ کے ذریعے یا اپنے آپ کو مسخر کرنا (اگرچہ کسی بھی مذہب کے ذریعہ منظور کیا گیا ہے) اسلام میں شکر گزار سمجھا جاتا ہے۔تصوف کی فلسفیانہ بنیادیں اس کے مابعد الطبیعات، کائناتی، اخلاقیات وغیرہ پر قائم ہیں۔اس کا وحدت الوجود یا خدا کے ساتھ اتحاد' کا تصور ویدانت/ اپنشدوں میں پائے جانے والے پینتھیزم کے مشابہ ہے۔دو اہم صوفی نقطہ نظر ہیں: پہلا، وحدت الوجود اس بات پر زور دیتا ہے کہ کائنات میں واحد سچائی خدا ہے اور یہ کہ تمام چیزیں اس کے اندر موجود ہیں۔اور دوسرا، وحدت الشہود یا ظاہر پرستی یا گواہی کی وحدت یہ کہتی ہے کہ خدا اور تخلیق کردہ دنیا کے درمیان اتحاد کا کوئی بھی تجربہ صرف مومن کے ذہن میں ہوتا ہے اور یہ کہ خدا اور اس کی مخلوقات بالکل الگ ہیں۔ایک صوفی ایک سالک یا مسافر ہے جو دنیا سے روحانی دنیا کی طرف سفر کرتا ہے، سیکھنے، آگاہی اور سمجھ کے مراحل سے گزرتا ہے، جس سے حقیقت کے حصول اور الٰہیت کی تفہیم کی طرف جاتا ہے۔

وحدت الوجود (وجود کی وحدانیت) پر مبنی خدا کے صوفی تصور کا مطلب ہر چیز یا کسی بھی چیز کی وحدانیت ہے۔یہ احساس ہے کہ حتما ورائی اور ممتاز دونوں ہے۔بعض اسلامی مصلحین نے دعویٰ کیا ہے کہ دونوں فلسفوں میں فرق صرف لفظیات میں ہے اور یہ ساری بحث محض "زبانی تنازعات" کا مجموعہ ہے جو مبہم زبان کی وجہ سے سامنے آئے ہیں۔تاہم، خدا اور کائنات کے درمیان تعلق کا تصور اب بھی صوفیاء اور غیر صوفی مسلمانوں دونوں کے درمیان فعال طور پر زیر بحث ہے۔

ابن عربی: انہیں عموماً وحدت الوجود کے عقیدہ کا بانی کہا جاتا ہے، لیکن یہ گمراہ کن ہے، کیونکہ وہ کبھی بھی اس لفظ کا استعمال نہیں کرتے۔ ان کی تصانیف میں ان اقتباسات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے اور نہ ہی وہ عصری فلسفہ اور الٰہیات کے عمومی رجحان میں جگہ سے باہر ہیں، یہ دونوں ضروری ہستی کے اتحاد کی تصدیق کرتے ہیں۔ ابن عربی کا موقف واضح کرنے کے لیے وحدت الوجود کو کیوں اکٹھا کیا گیا؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ توحید کو اپنے رہنما اصول کے طور پر اجاگر کرتا ہے اور وجود کو اپنے الفاظ میں ایک خاص اہمیت دیتا ہے۔ اس پر یہ بات بالکل عیاں تھی کہ خدا کے سوا کوئی حقیقی ہستی نہیں ہے اور خدا کے علاوہ ہر چیز غیر حقیقی ہے۔ یہ کہنے کا ایک اور طریقہ ہے جو ابنِ سینا کہتا ہے، کہ تمام چیزیں ممکن ہیں یا ضروری، وجود کو چھوڑ کر۔

مختصراً، ابن عربی نے حقیقی وجود پر ایک ایسی منفرد حقیقت کے طور پر توجہ مرکوز کی جس سے باقی تمام حقیقتیں نکلتی ہیں۔ شاذ و نادر موقعوں پر جب ان کے قریبی پیروکاروں نے وحدت الوجود کا لفظ استعمال کیا تو انہوں نے اسے فنی معنی نہیں دیا۔ وہ خدا کو ضروری ہستی کے طور پر بتانے کے لیے وضو کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ وہ اس اصطلاح کو خدا کے علاوہ ہر چیز سے بھی منسوب کرتا ہے، لیکن اس کا اصرار ہے کہ وضو کا تعلق کائنات میں پائی جانے والی چیزوں سے نہیں ہے۔ بلکہ چیزیں خدا سے وضو کو اسی طرح مستعار لیتی ہیں جس طرح زمین سورج سے روشنی لیتی ہے۔ اس کے نزدیک تمام چیزیں وضو کا خود انکشاف (تجلی) یا خود ظہور (احور) ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں خدا ہیں اور خدا کے علاوہ بھی۔ صرف خدا ہی تمام قبول کرنے والی اور ابدی حقیقت ہے۔ جو کچھ موجود ہے وہ حقیقی کا سایہ (تجلی) ہے اور خدا سے بے نیاز نہیں ہے۔ اس کا خلاصہ ابن عربی کے اپنے الفاظ میں ہے: "پاک ہے وہ ذات جس نے تمام چیزوں کو پیدا کیا، خود ہی ان کا جوہر ہے"۔ وجود یا حقیقی وجود کو "ایک" کہنا جوہر کی وحدت کی بات کرنا ہے۔

شیخ احمد سرہندی: وہ ایک ہندوستانی اسلامی اسکالر، حنفی فقیہ، اور نقشبندی صوفی حکم کے ممتاز رکن تھے۔ انہوں نے وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا جس کا مطلب ہے "وحدت گواہی"، "اتحادِ ادراک"، "وحدت ظہور" یا "ظہور کی وحدانیت"۔ اس نظریے کے مطابق، خدا اور مخلوق کے درمیان اتحاد کا تجربہ خالصتاً ہے۔ موضوعی اور صرف اس صوفی کے ذہن میں واقع ہوتا ہے جو فنا فی اللہ کی حالت کو پہنچ گیا ہو (اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کو بھول جانا) سرہندی نے وحدت الوجود کو افضل سمجھا، جسے وہ سمجھتے تھے۔ مطلق سچائی کے راستے پر ابتدائی قدم۔

شیخ احمد سرہندی نے اپنے آپ کو جس اہم کام کے لیے وقف کیا وہ یہ تھا کہ انسان کے خلیف ؟ اللہ فی الارض (زمین پر خدا کے نائب) کے طور پر قرآنی نظریہ کی تفہیم کو بحال کیا جائے جو الٰہ کے بارے میں مذہبی تصورات کی درآمد کے ذریعے تحلیل ہونے کے خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اور انسان - خدا اور انسان جیسا کہ توحید الوجود یا وحدت الوجود کے صوفیانہ نظریے کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے جسے ابن عربی اور بعد ازاں اشراقی (روشن خیالی) مکتبہ تصوف سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس نظریے کو باضابطہ طور پر مغل بادشاہ اکبر کے اعلان دین الٰہی (دی ڈیوائن فیتھ) کے ساتھ آگے بڑھایا گیا، جو ابن عربی کے صوفی افکار پر مبنی ایک ہم آہنگ مذہب تھا اور اس کی تحریروں میں بیان کردہ باطل کے بدھ مت کے تصور سے متاثر تھا۔ ناگ ارجن کے ساتھ ساتھ ہندو مت اور زرتشت مذہب کے ساتھ بھی تشبیہ تھی۔

دین الٰہی نے روح کا ذاتِ الٰہی کے ساتھ ملاپ اور ارواح کی منتقلی پر بھی زور دیا۔ شیخ سرہندی نے خالق اور مخلوق کے درمیان فرق پر زور دیا۔ اس نے وحدت الوجود کے عقیدہ کی تجویز پیش کرتے ہوئے وحدت الشہود (وحدت گواہی/تجرباتی اتحاد) کی پرورش کی جسے توحید شہودی یا توحید قرآنی بھی کہا جاتا ہے جو انسان اور مخلوق کی عبدیت (مخلوق) کو برقرار رکھتا ہے۔ شیخ سرہندی کا نظریہ وحدت الشہود اور عبدیت (مخلوق) کو برقرار رکھنا وحدت الوجود کی ہم آہنگی پر ایک متحرک تنقید تھی - جو اندلس - فارس - ہندوستانی تصوف کے ساتھ ویدانتک مونکتی بھاشنیت کے ذریعے مقبول ہوئی۔ وحدت الوجود کے نظریے نے خالق اور انسان، نیکی اور بدی کی تفریق کو مٹا دیا، کفر اور حق کے درمیان تعلق کو رشتہ دار بنا دیا، کوئی بھی مطلق برائی نہیں ہے، اس لیے انسان کی اخلاقی جدوجہد کو نظر انداز کر دیا۔

شیخ احمد سرہندی نے خدا اور انسان کے درمیان تعلق کی قرآنی تفہیم پر اصرار کرتے ہوئے انسان کو خدا کا عبد (عبادت کرنے والا) طاقت اور آزاد انتخاب پر زور دیا۔ اس کے لیے، دنیا خدا کی طرف سے فراہم کردہ ایک اسٹیج ہے جو اس کی انسانیت کو خدا کی الوہیت کی پہچان کے لیے تیار کرتا ہے۔ اس نے یہ نظریہ ترک کر دیا کہ خدا مطلق ہستی ہے۔ بلکہ خدا وجود اور غیر دونوں سے ماورا ہے۔ شیخ سرہندی نے اپنے کام کو فکری طور پر خدا کی توحید کا اثبات اور اثبات کے طور پر دیکھا، جو کہ تحلیل ہونے کے خطرے سے دوچار تھی۔ توحید کا ایک تنقیدی تجزیہ پیش کرتے ہوئے توحید کی صحیح تفہیم کو زندہ کرنے کے کام کے لیے خود کو وقف کرنا جس نے اپنی مختلف اور جامع شکلوں میں نہ صرف ہندوستان

بلکہ پوری دنیا میں صوفی نیٹ ورکس کے ذریعے صوفی نظریے کی ترویج کی۔ شیخ سرہندی نے یہ کام اسلام کی جذباتی اپیل کے ذریعے نہیں بلکہ قرآن وسنت اور اپنے شہدِ صوفیہ کی روشنی میں صوفیانہ تجربات کی تجزیاتی درجہ بندی پیش کر کے کیا۔ انہوں نے لکھا کہ مطلق، وجود کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنے جوہر کی وجہ سے ہے۔ احمد سرہندی کے نظریے کے مطابق، خدا اور تخلیق کردہ دنیا کے درمیان اتحاد کا کوئی بھی تجربہ خالصتاً موضوعی ہوتا ہے اور صرف مومن کے ذہن میں ہوتا ہے۔ حقیقی دنیا میں اس کا کوئی معروضی ہم منصب نہیں ہے۔

بدیع الزمان سید نورسی: یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر شیخ احمد اسلام کے مذہبی دائرے میں بت پرستانہ مذہبی سوچ کے ظہور کے پیش نظر اسلام کی تجدید کرنے والے تھے تو سید نورسی نے زمانے میں قرآن کے زوال کو بچانے کے لیے زندگی گزاری اور جدوجہد کی۔ جب نہ صرف ترک ملت بلکہ عالمی انسانیت کو ایک بڑے اور فکری طور پر حیران کن چیلنج کا سامنا زندگی اور فکر کے بارے میں میکانکی نقطہ نظر اور نقطہ نظر کی صورت میں تھا۔ اس نے صوفی روایت میں انقلاب برپا کیا، رسالہ نور کو قرآن کا ایک بے ساختہ استاد اور رہنما بنا کر، شیخ / مرید روایت کو قرآن کے درمیان فکری طور پر زندہ اور متحرک تعامل کے ساتھ تبدیل کیا۔ دماغِ نورسی نے رسالہ نور کے ذریعے کامیابی سے قرآن پر مادیت پسندوں اور ملحدوں کے حملوں کی تردید کی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سائنس، عقل اور قرآن میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

بلکہ یہ کشمکش مادیت پسند فلسفے کی الحاد کی حامی بنیاد اور قرآن کے مذہبی عالمی نظریہ کے درمیان ہے جو خدا کے وجود کی تصدیق کرتا ہے۔ جدید یورپی فلسفیانہ اور سائنسی نظریات اور مسلم دنیا میں ان کے اثر ورسوخ کو پھیلانے کے بارے میں روشن خیال، نورسی نے کہا کہ" مادیت پسند فلسفے کے شیشے ہر چیز کو تاریک، بدصورت اور خوفناک دکھاتے ہیں جب کہ خدا پر یقین کا شیشہ ہر چیز کو شفاف بنا دیتا ہے، واضح اور روشن۔ اس طرح ان دو زاویوں سے اخذ کیے گئے عالمی خیالات انسانوں کی زندگی، رویے اور طرز عمل میں فرق پیدا کرتے ہیں۔ سید نورسی نے کائنات کے بارے میں قرآنی نظریہ کو مذہبی اعتبار سے مستند اور عقلی طور پر سائنسی انداز میں پیش کرنے کا فریضہ سرانجام دیا، جذباتی بیان بازی سے نہیں بلکہ قرآن کے بارے میں درسی طور پر صحیح اور وسیع گفتگو کے ذریعے۔ سید نورسی کے لیے، ایمان ایک فعال مظہر ہے۔ ایک زندہ تجربہ جس کی جڑیں ہدایت اور قرآن کے آفاقی احکامات سے جڑی ہیں تاکہ ابدی وحی میں جڑے ہوئے زمانے سے متعلقہ کائنات کے بارے میں

ایک نیا نظریہ تشکیل دیا جا سکے، جس سے مایوس مسلمانوں کو امید ملتی ہے۔

وقت سے متعلقہ قرآن، اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں فعال تفہیم پیش کرنا شیخ سرہندی کی طرح سید نورسی نے بھی مسلم دنیا میں اس بیماری کے علاج کا بیڑا اٹھایا جس سے مسلم ذہن اور دنیا کے سامنے قرآن کے ضروری پیغام کو پیش کیا جائے جو دھندلا ہوا تھا۔ یہ ان کے لیے ایک عظیم تر جہاد، زندگی بھر کا مشن بن گیا اور یہ رسالہ نور کا سب سے بڑا موضوع ہے، جیسا کہ شیخ سرہندی کی طرف سے وحدت الشہود کے دعوے کی طرح ہے۔ مذہبی عقیدہ انسان کے لیے خدا کی رہنمائی کا نتیجہ ہے اور انسان کا اس کائنات کا عکس اور مطالعہ جسے وہ "تھیٹر آف نیچر" یا "قدرت کی عظیم کتاب" کہتا ہے، جو ایک متوازن اور منظم کائنات ہے۔ خالق کی طرف سے انسان کو اس کے رزق اور نشوونما کا ذریعہ بناتا ہے۔ ایک شوقین آدمی منطقی اور سائنسی طور پر یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ فطرت عبادت کے لائق ہے یا اسے خالق کو رد کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ کائنات کے مادیت پرست اور ملحدانہ تصورات کے معاملے میں دیکھا جاتا ہے۔ بلکہ یہ زمین پر قیام کے دوران انسانیت اور دیگر انواع کی فلاح و بہبود کے لیے خدا کی طرف سے امانت ہے۔ نورسی نے کہا کہ کائنات ایک طاقتور محل کی ہر سطح پر کھڑکیوں کی طرح ہے، جو خدا کی تخلیقی صلاحیتوں کا خوبصورت منظر پیش کرتا ہے اور اپنی رحمت سے کہ دیکھنے والا انحراف میں نہ بھٹک جائے، اللہ تعالیٰ نے ہر دل میں ایک "ہاٹ لائن" ربط قائم کر دیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق ہے، جو زندگی بھر کے لیے 24 گھنٹے مفت دستیاب ہے۔

اس طرح خدا کے وجود اور پرووِیڈنس کو ظاہر کرنے والے واضح ثبوت انسان کے لیے ہر قسم اور شکل میں دستیاب ہیں۔ یہاں تک کہ ہر انسان کا انفرادی پروفائل جو پیدا ہوتا ہے اور مرتا ہے، جانوروں اور پودوں کی سینکڑوں انواع کا وجود (نباتات اور حیوانات)، جغرافیائی اور فلکیاتی مظاہر میں سال بھر کی تبدیلی، ماحولیات، حیاتیات، فزیالوجی، فزیومیٹری، فزیوپیتھولوجی، وغیرہ، لامحدود اور بہت بڑی سطحوں پر، جو کہ کائنات اور انسان کے تمام حکیم خالق خدا کے وجود اور قدرت کے لاکھوں ثبوتوں پر مشتمل ہے۔ کہا کہ نورسی انسان اور خدا کے درمیان تعلق کا ایک الہامی، فکری، سائنسی، عقلی ثبوت پیش کرتا ہے۔

وہ انسانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد رونما ہونے والے زندگی بھر کے روزمرہ کے واقعات پر علمی انداز میں غور و فکر کریں اور خدا کے وجود اور اس کے اپنے اور کائنات کے ساتھ اس

کے تعلق کے حتمی ثبوت پیش کریں جو کہ خالق اور خلق کے درمیان ہے۔ کیونکہ تمام انسانیت کو سوچنے کی صلاحیت سے نوازا گیا ہے اور قرآن میں انہیں" سوچنے والے لوگ" کے طور پر مخاطب کیا گیا ہے، بدیع الزمان سید نورسی نے اپنے روحانی ساتھی شیخ احمد سرہندی کی طرح اسلام کے احیاء※ اور تجدید کی کوشش کی۔ ان کے دور کی فکری ملاقاتیں شیخ احمد سرہندی اور سید نورسی کے نقطہ نظر میں طریقہ کار کا تضاد ان کی کوششوں کے مواد اور اسلوب میں پنہاں ہے، مختلف قسم کے چیلنجوں سے نمٹنے میں جو قرآنی تصور پر سوال اٹھاتے ہیں کہ انسان کیا ہے اور خدا کیا ہے اور ان کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ شیخ سرہندی نے تصوف کے ابھرتے ہوئے فلسفیانہ تصوف اور توحید کے متعلقہ مابعد الطبیعات کی قرآنی تردید کی۔

جب کہ سید نورسی نے ایک فکری طور پر درست قرآنی جواب پیش کیا جس میں حقیقت کے تصورات کی ترویج کی گئی جس میں مثبتیت اور ہیومنزم کے نظریاتی احاطے کی بنیاد پر خدا کو ایک " ضروری مفروضہ" بنا دیا گیا۔ شیخ احمد سرہندی نے وحدت الشہود (وحدت گواہ/تجرباتی اتحاد) کے اصول کی تجویز کے ذریعے اور سید نورسی نے وحدت النور یا توحید نوری (روشنی/تجرباتی روشنی کی وحدت) کے ذریعے کہا۔

تشکیک الوجود: وحدت الوجود کی صدری تشریح تشکیک کہلاتی ہے۔ اس مکتب کے مطابق حقیقت اور وجود یکساں ہیں جس کا مطلب ہے کہ وجود ایک ہے لیکن شدت میں درجہ بندی ہے۔ اس طریقہ کار کو تشکیک الوجود کا نام دیا گیا اور اس طرح یہ وضاحت کرتا ہے کہ وجود کا درجہ ہے جو فرش سے عرش الٰہی (عرش) تک وجود (مراتب الوجود) کے ایک وسیع سلسلہ وار سلسلہ میں کھڑا ہے۔ ہر ایک موجود مایہ کا فطرت صرف وجود کی واحد حقیقت کے درجے کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا سرچشمہ خدا، مطلق ہستی (الوجود المطلق) ہے۔ جو چیز مختلف موجودات کے فطرت میں فرق کرتی ہے وہ طاقت اور کمزوری کے مختلف درجات میں فطرت کے سوا کچھ نہیں۔ کائنات کچھ بھی نہیں مگر فطرت کی طاقتوں اور کمزوریوں کے مختلف درجات ہیں، جن میں فرشتہ حقیقتوں کے وجود کے شدید درجے سے لے کر ادنیٰ خاک کے مدھم وجود تک ہیں جس سے آدم کو بنایا گیا تھا۔

الوجود المنبسط (خود کو ظاہر کرنے والا وجود): شاہ ولی اللہ دہلوی نے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے دو عقائد کو ملانے کی کوشش کی۔ انہوں نے ان اختلافات کو زبانی تنازعات' کہا جو مبہم زبان کی وجہ سے سامنے آئے ہیں۔ اگر ہم خیالات کے اظہار کے لیے استعمال ہونے والے تمام استعارے

اورتشبیہات کوایک طرف چھوڑ دیں تو دونوں مابعد الطبیعات کے بظاہر متضاد خیالات متفق ہوں گے۔ وہ وجود کے مراحل، ادراک کی صلاحیت، کائنات کے ساتھ تجرید کا تعلق، آفاقی روح اور انسان کی روح، موت کے بعد، جوہر، معجزات، انسان کی وسعت، کامل کی روح، آفاقی ترتیب، ماخذ پر بحث کرتا ہے۔ظہور کا، اور تصوف کا معیار سے معیار میں تبدیلی۔ان کی رائے میں یہ پوری کائنات نفس ہے جیسا کہ ایک فرد کا ایک نفس ہوتا ہے جسے عالم ارواح (النفس الکلی) کہا جاتا ہے۔ساری کائنات کی کثرت اسی سے پیدا ہوئی ہے۔ جب ابن عربی کہتے ہیں کہ ہر چیز خدا ہے تو اس سے مراد عالم ارواح ہے۔

یہ عالمگیر روح، یا خود کو ظاہر کرنے والی ہستی (الوجود المنبسط) خود قائم رہتی ہے۔ یہ وجود مادہ اور حادث دونوں پر پوری کائنات پر محیط ہے اور ہر چیز کی شکل کو قبول کرتا ہے۔ یہ لازوال اور ماورائی بھی ہے۔اس وجود (عالمی روح) سے آگے اصل وجود (خدا) تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں، انسان کی ترقی کائناتی روح یا خود کو ظاہر کرنے والے وجود پر ختم ہوتی ہے۔ وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔آفاقی روح اور خدا اس قدر باہم مل گئے ہیں کہ پہلے کو اکثر بعد کے لیے لیا جاتا ہے۔

وحدت المقصود: سلطان باہو نے یہ تصور پیش کیا جس کا مطلب ہے اتحاد کا ارادہ' یا اتحاد کی ضرورت۔ سلطان باہو نے 'فنا فی اللہ' 'بقاء باللہ' (خدا میں فنا، خدا کے ساتھ باقی رہنا) کے تصور کی طرف بہت زیادہ دلچسپی اور توجہ دی۔

نتیجہ: اللہ کی وحدانیت کا قرآنی تصور اتنا کامل اور قطعی ہے کہ ہمیں اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔اسلام میں اللہ کی وحدانیت پر ایمان توحید ہے۔اس کا اظہار کلمہ" لا الہ الا اللہ" (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) کی صورت میں ہوتا ہے۔اسلام کی بنیاد اور جوہر اس خوبصورت سادہ جملے کی بنیاد پر ہے۔ایک اعلیٰ ہستی پر ہے، جو الٰہی صفات کا حامل ہے، جو تمام مظاہر کے پیچھے مرضی ہے، کائنات کا خالق، اس کے تمام کاموں کا منتظم، اس کی الوہیت سے کوئی اور چیز وابستہ نہیں ہے۔خدا کے بشری تصور کو رد کرتے ہوئے، قرآن خدا کے ماورائی تصور پر زور دیتا ہے۔

قرآن کے مطابق اللہ (خدا) کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ حاکم ہے، مقدس ہے، امن کا سرچشمہ ہے، ایمان کا محافظ ہے، حفاظت کا محافظ ہے، طاقت میں بلند ہے، اعلیٰ ہے۔ وہ خالق ہے۔ وہ شکلوں کا عطا کرنے والا ہے۔سب سے خوبصورت نام اسی کے ہیں۔وہ طاقت میں بلند ہے۔

اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ خدا سختی سے واحد (توحید)، منفرد (واحد)، فطری طور پر ایک (احد)، رحم کرنے والا اور قادر مطلق ہے۔

اور قرآن کے مطابق، ''کوئی بصارت اسے نہیں پکڑ سکتی، لیکن اس کی گرفت تمام بینائی پر ہے: وہ ہر چیز سے بالاتر ہے، پھر بھی ہر چیز سے واقف ہے۔''

اور ڈی بی میکڈونلڈ کے الفاظ میں جس کے ساتھ اس نے مسلم الٰہیات کی ترقی پر اپنی کتاب کا اختتام کیا، اور کہا کہ ''اس نے (محمد (ص) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ایک سادہ سا الٰہیات پیش کیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ بہت ہی سادہ الٰہیات اس وقت پیچیدہ ہو جاتی ہے جب ماہرین الٰہیات، شاعر، صوفیاء اور فلسفیوں کے مختلف بحثوں کا توازن کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر مزید تحقیق کی بہت ہی اشد ضرورت ہے۔

حوالہ جات اور نوٹس:

1۔ جاوید احمد غامدی، میزان، المورد، لاھور، 2007، ص 88 2۔ غلام حیدر آسی، مسلم انڈرسٹینڈنگ آف ادر ریلیجنز، انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ، پاکستان، 1991، ص 36۔ جاوید احمد غامدی، میزان، المورد، لاھور، 2007، ص 112 4۔ مولانا وحید الدین خان، اسلام ریڈسکوارڈ، گوڈورڈ بکس، دہلی، 2005، ص 534۔ جاوید احمد غامدی، میزان، المورد، لاھور، 2007، ص 88۔89؛ القرآن: 35:24 6۔ القرآن 6: 75۔78 بحولہ اسلام ریڈسکوارڈ، اور جاوید احمد غامدی، میزان، المورد، لاھور، 2007، ص 25 7۔ جاوید احمد غامدی، میزان، المورد، لاھور، 2007، ص 128۔9 8۔ غلام حیدر آسی، مسلم انڈرسٹینڈنگ آف ادر ریلیجنز، انٹرنیشنل انسٹیٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ، پاکستان، 1991، ص 8 9۔ جاوید احمد غامدی، میزان، المورد، لاھور، 2007، ص 7۔126 10۔ جاوید احمد غامدی، میزان، المورد، لاھور، 2007، ص 88

11۔ القرآن 172:7 12۔ جاوید احمد غامدی، میزان، المورد، لاھور، 2007، ص 129

13۔ القرآن 172:7 14۔ القرآن 40:22 15۔ القرآن 40:22 16۔ القرآن 17: 110 17۔ القرآن 11:42

Urdu Zaban-o-Adab ke Farogh mein Internet ka Role by Tanzeel Athar(Asst. Prof. Urdu Araria College Araria)

تنزیل اطہر (اسسٹنٹ پروفیسر، اراریہ کالج اراریہ)

اُردو زبان وادب کے فروغ میں انٹرنیٹ کا رول

ڈیجیٹل انقلاب کے اس دور میں انٹرنیٹ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انٹرنیٹ ہماری زندگی میں اس طرح داخل ہو رہا ہے کہ ہمیں اس کا علم بھی نہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس کا عمل دخل بڑھ رہا ہے۔ e-ticket,e-commerce, e-governance, e-education,-e-journalism e-Books وغیرہ وغیرہ۔ انٹرنیٹ نے انسان کو اطلاعات کی اس شاہراہ پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ آج پوری دنیا میں سب سے تیز ذرائع ترسیل کے طور پر اسی میڈیم کا استعمال ہو رہا ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے اطلاعات و معلومات حاصل کرنے والوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اس کا اندازہ ہم درج ذیل ڈاٹا سے لگا سکتے ہیں۔ Internet world states کے مطابق ہندوستان میں 2000ء سے لے کر اب تک انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ اس ویب سائٹ کے ذریعے کرائے گئے سروے کے مطابق درج ذیل ڈاٹا سامنے آیا ہے:

سال	انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی تعداد	ہندستان کی کل آبادی کا انٹرنیٹ فیصد
2000	5,500,000	0.5%
2005	50,600,000	4.5%
2010	81,000,000	7.0%
2015	37,50,42000	33.23
2020	330 Million	43%

"Asia Inernet Users & Population states" کے مطابق سال 2020 میں ہندوستان کی کل آبادی 1 عرب 26 لاکھ تھی۔ اور اس میں انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی

تعداد Million 330 ۔یعنی 43%لوگ انٹرنیٹ استعمال کرتے ہیں۔اور اس میں ہر سال 20% کا اضافہ ہورہا ہے۔ اسی طرح پاکستان کی کل آبادی 185,132,926اور انٹرنیٹ استعمال کر نے والوں کی تعداد20,073,929یعنی 10% لوگ انٹرنیٹ استعمال کرتے ہیں۔مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہتر انٹرنیٹ کنکشن' کمپیوٹر ہارڈ ویئر کا سستا ہونے اور مقامی زبانوں میں کمپیوٹر فاؤنٹ کی دستیابی نے برصغیر میں اردو کی ایک بڑی آبادی کو ورلڈ وائڈ ویب سے جوڑ دیا ہے۔لیکن ایک بڑی آبادی اب بھی انٹرنیٹ سے محروم ہے۔

آج سے ایک دہائی پہلے کسی نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ انٹرنیٹ پر اردو بھی پڑھی لکھی جائے گی۔البتہ ہندستان اور پاکستان کے کچھ سرکاری اشتہاروں میں گاہے بگاہے اردو نظر آجاتی تھی۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت آن لائن کی دنیا پر انگریزی زبان کا غلبہ تھا۔اور اب بھی تکنیکی روپ سے انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں کا ہی بول بالا ہے۔حالانکہ اردو دنیا کی گیارویں سب سے بڑی زبان ہے لیکن آبادی کے تناسب سے انٹرنیٹ کی دنیا میں اس کا استعمال بہت کم ہے۔Country "Wise Internet User and Population States" کے مطابق انٹرنیٹ پر دس بڑی زبانیں حسب ذیل ہیں:

انٹرنیٹ کی دس بڑی زبانیں	%(کل انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کا)
English	28.9
Cahinese	14.7
Spanish	8.9
japanes	7.6
Germen	5.2
French	5.0
Korean	3.6
Italian	3.0
Arabic	2.7
دنیا کی دس بڑی زبانیں	82.8(مجموعی)
دنیا کی باقی زبانیں	17.7

یہ ہے انٹرنیٹ کے استعمال کا مختصر خاکہ۔اس میڈیم میں اردو زبان کے استعمال کے بارے میں گفتگو کرنا ہمارا اصل مقصد ہے۔ www.meco.com کے مطابق ہند۔پاک میں 10.8 ملین اردو آبادی اطلاعات ومعلومات حاصل کرنے کے لئے انٹرنیٹ کا استعمال کرتی ہے۔

حالانکہ انٹرنیٹ کی دنیا میں اردو کی عمر زیادہ نہیں ہے۔لیکن اس مختصر سے وقت میں اردو کے چاہنے والوں نے ویب ورلڈ پر ایک نئی اردو دنیا بسادی ہے۔گوگل سرچ کے مطابق فی الحال نیٹ پر مختلف نوعیت کی 26,60,000 اردو کی ویب سائٹس ہیں۔جبکہ اردو کی ادبی، اطلاعاتی ومعلوماتی ویب سائٹس کی تعداد تقریبا1000 ہے۔انٹرنیٹ اردو کی ترویج واشاعت میں اہم رول ادا کررہا ہے۔یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انٹرنیٹ نے ہی اردو کو گلوبل زبان بنایا ہے۔آج سے پہلے کبھی اردو زبان کی اتنی پہنچ نہیں تھی جتنا کہ ورلڈ وائڈ ویب کے اس دور میں ہے۔پہلے لوگ ہندستان کا اردو اخبار پاکستان میں اور پاکستان کا اردو اخبار امریکہ میں نہیں پڑھ سکتے تھے۔ڈاک کے ذریعے اگر اخبار و رسائل منگوائے بھی جاتے تھے تو خبریں اور مضامین باسی ہو جاتے تھے۔لیکن آج انٹرنیٹ کے ذریعے کناڈا' امریکہ میں بیٹھا شخص ایک بٹن دبا کر ہندوستان کے اردو اخبار، میگزین اور دیگر ویب سائٹ کی ورق گردانی کرسکتا ہے۔ہزاروں کی تعداد میں نیوز ویب سائٹس لوگوں کو ہر پل اطلاعات و معلومات فراہم کررہے ہیں۔

الیکٹرانک میڈیم میں انٹرنیٹ ایک ایسا وسیلہ ہے، جہاں اردو زبان و ادب کی ایک پوری لائبریری موجود ہے۔انٹرنیٹ ویب سائٹس کی ایک بڑی خوبی اس کا Archive ہے۔جس کی وجہ سے دوسرے میڈیا کے مقابلے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔قارئین ایک مہینے، ایک سال یا کئی سال پہلے کی چیزوں کو سرچ میں جا کر بڑی آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔اردو ویب سائٹس نہ صرف لوگوں کو کلاسیکل لٹریچر مہیا کروارہی ہیں بلکہ اردو کے نایاب نسخے اور مخطوطے کو محفوظ کرنے کا بھی اہم کام کر رہی ہیں۔ انٹرٹیٹ/آن لائن صحافت سے پہلے اردو کی بہت سے تخلیقات (شائع یا غیر شائع شدہ) برباد ہوجایا کرتی تھیں۔لیکن اب اردو ویب سائٹس ان تخلیقات کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کررہی ہیں۔انٹرنیٹ پر اردو کی بڑی لائبریری بھی موجود ہے۔جہاں آپ دنیا جہاں کی اردو کتب و رسائل پڑھ سکتے ہیں۔مثال کے طور پر۔۔۔

آن لائن اردو لائبریری

- www.rekhta.org

- wwq.urducouncil.nic.in/E_Library/urdu_Digital
- www.iqbalcyberlibrary.net
- www.urdulibrary.org
- www.urdubookslibrary.blogspot.com
- www.urdupubliclibrary.com
- www.minhajbooks.com/udru
- www.zubiweb.com

انٹرنیٹ پر جتنی خبروں کی ویب سائٹس ہیں اس سے کہیں زیادہ ادبی، تفریحی، تجارتی اور سوشل ویب سائٹس ہیں۔ دلچسپ بات ہے کہ انٹرنیٹ پر پہلی ویب سائٹ ایک ادبی ویب سائٹ (اردستان ڈاٹ کام) ہی تھی۔ ایسے دور میں جب اردو اخباروں اور رسالوں کے قارئین کی تعداد دن بدن گھٹتی جارہی ہے۔ انٹرنیٹ پر خبروں کی ویب سائٹ اور ای۔ میگزین کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ چونکہ انٹرنیٹ پر نہ تو اشاعت کا خرچ ہے اور نہ ہی سرکولیشن کی پریشانی۔ اردو قارئین کے فقدان کے اس دور میں انٹرنیٹ نئے قارئین کا گروہ پیدا کر رہا ہے۔ فی الحال نیٹ پر اردو کی ہزاروں کتابیں، شعری مجموعے اور رسالے موجود ہیں۔ اب ایک نظر ڈالتے ہیں اردو کی کچھ بڑی ادبی ویب سائٹ پر جن سے آن لائن کی دنیا میں اردو کی پہنچ کا اندازہ لگایا جا سکے گا اردو کی بڑی اور اہم ادبی ویب سائٹس۔

- https://rekhta.org
- www.Urdu.com
- www.univarsalurdupost.com
- urdustan.com
- Bazgasht.com
- Urdu Poetry .com
- eBazm.com
- Shairy.com
- Bazmesukhan.wordpress.com
- Urdufun.com

- Urdumaza.com
- salamurdu.com
- loveurdu.com
- Urdudost.com
- Urduclassic.com
- Urdumanzil.com
- urdughar.com
- urdustuff.com

ان ویب سائٹس میں اردو کی پوری دنیا آباد ہے۔شعروشاعری،فکشن،طنزومزاح،تنقید وتحقیق،صحافت غرض اردو کے تمام اصناف سے آپ یہاں استفادہ کر سکتے ہیں۔اس کے علاوہ شاعروں اور ادیبوں کی آفیشیل ویب سائٹس بھی ہیں۔ جہاں ان کی تخلیقات کو مفت پڑھا جا سکتا ہے۔مثلاً 'www.faiz.com 'www.allamaiqbal.com 'www.mirzaghalib.in' www.gulzaronline.com'www.javedakhtar.com ' وغیرہ۔

اردو کی کچھ ایسی صنفیں ہیں جو پڑھنے سے زیادہ سنی جاتی ہیں۔مثلا۔غزل' گیت، نعت وحمد۔اس کے علاوہ اردو تہذیب کی عکاس مشاعرہ' قوالی بھی بڑے پیمانے پر نیٹ پر دستیاب ہیں۔کئی دفعہ آپ چاہ کر بھی اپنی پسندیدہ غزل' قوالی یا مشاعرہ سن یا دیکھ نہیں سکتے لیکن اردو کی کئی ادبی ویب سائٹس ہیں جہاں جا کر آپ کبھی بھی' کسی بھی وقت اپنی پسند کی غزلیں' مشاعرے،نعت وحمد سن سکتے ہیں۔ یہاں ان ویب سائٹس کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اردو کو پھیلانے اور اسے مقبول بنانے میں اہم رول ادا کر ہی ہیں۔غیر اردو داں طبقوں میں بھی یہ ویب سائٹس کافی مقبول ہیں۔مثلاً

- www.mushaira.org
- www.urdupoetry.com/audio.html
- www.urdustan.com/awaz
- www.urdulife.com
- www.naat.co.uk
- www.alquranic.com

اس کے علاوہ انٹرنیٹ پر اردو سیکھنے اور سکھانے کے لئے بھی کئی ویب سائٹیں دستیاب ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا میں آن لائن ہی ایک ایسا میڈیم ہے جہاں آپ جب چاہیں اردو زبان سیکھ سکتے ہیں۔ بڑی تعداد میں غیر اردو داں ایسی سائٹیوں سے فائدہ اٹھا کر مفت اردو سیکھ رہے ہیں۔ یہاں کچھ ویب سائٹس کی فہرست دی جارہی ہے۔ جو اردو کی ترویج وترسیل میں اہم رول ادا کررہی ہیں:

- http;//urdu-sikho.blogspot.com
- www. pakdata.com/ alif/
- www.ukindia.com/zurdu1.htm
- www.bbc.co.uk/ languages/other/guide/urdu
- www.learningurdu.com
- www.urdureading.com
- www.urdu-english.com
- www. mezzoguild.com

اس طرح کے نیوز اور ادبی ویب سائٹس کے علاوہ ذاتی بلاگ اور سوشل ویب سائٹ کے ذریعے بھی اردو پوری دنیا میں اپنا جادو چلا رہی ہے۔ دنیا میں ہزاروں ایسے لوگ ہیں جن کی تخلیقات اخبار یا کسی میگزین میں شائع نہیں ہو پاتی ہیں یا پیسے کی کمی کے سبب وہ چھپوا نہیں سکتے۔ ایسے لوگ اپنی نگارشات سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس اور اپنے بلاگ میں لکھ کر اردو جاننے والوں یا چاہنے والوں تک پہنچا رہے ہیں۔ اس سے نہ صرف نئی تخلیقات سامنے آرہی ہیں بلکہ اردو ادبی صحافت کا دائرہ بھی وسیع ہورہا ہے۔ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ (فیس بک، ٹویٹر، گوگل پلس وغیرہ) اردو کے ایک بڑے پلیٹ فارم کے طور پر ابھر رہی ہے۔ بڑی تعداد میں یہاں ادب تخلیق ہورہا ہے۔ اپنے جاننے اور چاہنے والوں سے جڑنے کا یہ ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعے لوگ بنا کسی خرچ کے اپنی تخلیقات سیدھے ہزاروں قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔ چونکہ سوشل میڈیا ایک Interactive میڈیم ہے اس لئے یہاں قارئین و ناظرین کے لئے کافی جگہ ہے۔ یہاں کوئی رسمی دیوار نہیں، لوگ کھل کر نئی تخلیقات پر اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر ایک نئے طرز کا ادب جنم لے رہا ہے۔ موضوع، زبان و بیان کے لحاظ سے اس میں ایک طرح کا نیا پن ہے۔ فیس بک پر لوگ غزل، گیت، ادبی مضامین لکھ

رہے ہیں۔ٹویٹر پر قطعہ، کہانیاں اور افسانچے وجود میں آرہے ہیں۔کچھ لوگ اسے فیس بکیا ادب کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔لیکن فیس بک، ٹویٹر پر بھی سنجیدہ ادب جنم لے رہا ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔بعض کو فیس بک پر اتنی Likes ملتی ہیں کہ اردو ادب کے اچھی تخلیق کو بھی اتنے قاری نہیں مل پاتے۔سوشل میڈیا پر اچھا برا سبھی طرح کا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ظاہر ہے جو اچھی تخلیق ہوگی۔قاری خود بخود وہاں کھینچے چلے آئیں گے۔کل ملا کر کہا جا سکتا ہے کہ کتابوں سے باہر بھی نیو میڈیا میں ادب کی دنیا آباد ہو رہی ہے۔جس نے اردو کے فروغ میں چار چاند لگا دئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بلاگنگ سے اردو زبان کو ترقی مل رہی ہے۔جو لوگ روزی روٹی یا نوکری کے چکر میں اپنی زبان سے دور ہو گئے تھے، بلاگنگ کے ذریعے اپنی مادری زبان سے دوبارہ جڑ رہے ہیں۔اس نے نئی نسل کو اردو سے لگاؤ پیدا کرنا سکھا دیا ہے۔کچھ کہنے اور لکھنے کی حسرت تو سبھی کے دل میں ہوتی ہے۔لیکن اگر بلاگنگ کا ذریعہ نہیں ہوتا تو وہ سب باتیں دلوں میں ہی دفن ہو کر رہ جاتیں۔بلاگنگ سے اردو زبان و ادب کو میر و غالب، منٹو، بیدی جیسے شاعر و ادیب بھلے ہی نہ مل پائیں لیکن نئی نسل کو اردو زبان و ادب سے قریب ضرور لے آئی ہے۔

بلاگنگ صحافت پر بھی اثر ڈال رہی ہے۔اطلاعات و معلومات کے متبادل ذرائع کے طور پر امریکہ اور یورپ میں لوگ اب صحافیوں سے زیادہ بلاگروں پر بھروسہ کرنے لگے ہیں۔اسے دیکھتے ہوئے دنیا کے کئی بڑے اخباروں نے بلاگروں کو اپنے ایڈیٹوریل پیج پر جگہ دینی شروع کر دی ہے۔اردو کے کچھ اخباروں نے بھی اچھا بلاگ لکھنے والوں کے مضامین شائع کرنا شروع کر دئے ہیں۔ٹی وی نیوز چینلوں میں بھی حالات حاضرہ کے پروگرام میں بحث و مباحثے کے لئے بلاگرس بلائے جانے لگے ہیں۔انٹرنیٹ پر اردو کی عمر ابھی بہت طویل نہیں ہے۔لیکن اس دوران اردو سے محبت رکھنے والوں نے انٹرنیٹ پر متعدد نوعیت کی اردو ویب سائٹس بنا کر اردو کی ایک نئی دنیا قائم کر دی ہے۔لیکن ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے۔اردو کی ایک بڑی آبادی ابھی بھی انٹرنیٹ کی پہنچ سے باہر ہے۔لیکن جس طرح کمپیوٹر تعلیم عام ہو رہی ہے، انٹرنیٹ کنکشن سستا ہو رہا ہے، انٹرنیٹ پر اردو کی تکنیکی مشکلات دور ہو رہی ہیں۔اسے دیکھتے ہوئے انٹرنیٹ پر اردو کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔

Nazim Shikarpuri ka Nazm-e-Sher-o-Sukhan by Wafa Naqvi
(Aligarh) cell-9219782014

وفا نقوی (علی گڑھ)

ناظمؔ شکارپوری کا نظمِ شعر و سخن

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ہر عہد کی شاعری اپنی پچھلی شاعری سے مختلف اور منفرد ہوتی ہے لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یکسر روایت کو بھلا دینا آسان ہے۔ کہیں نہ کہیں شعوری یا لاشعوری طور پر شاعر کے ذہن پر اپنے اسلاف کے ہنر کی چھاپ ضرور ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ہم روایت کی پیروی کے منکر ہیں اور جدید راہِ سخن کے دلدادہ ہیں یا پھر اپنے لئے خود اپنی راہ تیار کرتے ہیں اور اس پر چلتے ہیں وہ اپنے دعوے اور کارگزاری میں اس حد تک تو صحیح ہو سکتے ہیں کہ ان کا ذہن نئی فضائے ادب کی طرف آمادہ ہوتا ہے لیکن مجموعی طور پر ان کے کلام کے مطالعے کے بعد ہم قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ روایت شکن ہونے کے ساتھ ساتھ روایت فراموش یا روایت کُش بھی ہیں۔ مثلاً ہم اردو ادب کے جدید شعراء جن میں خلیل الرحمٰن اعظمی، ناصرؔ کاظمی، شکیبؔ جلالی، احمد مشتاقؔ، افتخار عارفؔ، ظفرؔ اقبال، بشیر بدرؔ وغیرہ کو دیکھ سکتے ہیں بلا شبہ ان کے یہاں جدیدیت کے رنگ وافر مقدار میں ملتے ہیں اور اس راہ میں ان کا اختصاص بھی ہے لیکن کوئی سخن شناس یا اہلِ نقد و نظر کسی بھی طرح یہ نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے اپنی روایت سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ کیوں کہ عصرِ حاضر کی شاعری ایک درخت کی طرح ہے اور اس کی جڑیں روایت کی مانند ہیں اگر کسی درخت کی جڑیں ہی مستحکم نہ ہوں تو اس کی شاخیں پھل پھول نہیں سکتی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ان شاخوں کی بلندی و پستی، لچک اور سختی یا سرسبزی و شادابی یا کسی اور صورت کو دیکھ کر اس کے بارے میں رائے قائم کی جائے۔

ادب کا مسئلہ بھی یہی مسئلہ ہے جب کسی کے بارے میں رائے قائم کی جاتی ہے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ شاعر کی طبیعت کس طرف زیادہ مائل ہے؟۔ اس میں یہ تخصیص نہیں کہ وہ شاعر کس عہد کا ہے یا کس رجحان یا تحریک کے تحت اپنی نگارشات پیش کرتا ہے۔ ناقد کے لئے ضروری ہے کہ وہ

اس کے کلام میں اس راز تک پہنچنے کی سعی کرے کہ شاعر کے مافی الضمیر میں کون سی فکر پیوست ہے جس کو وہ اپنی تخلیق کے ذریعے سے منکشف کرتا ہے۔اس سلسلے سے ہم دیکھتے ہیں کہ آوازوں کا ایک ہجوم ہمارے ذوقِ سخن کی سماعت پر اثر پزیر ہے۔بعض دفعہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ بیشتر آوازوں میں یکسانیت ہے تو کہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ منفرد آوازیں ہماری سماعت کو روشن کرتے ہوئے قلب تک کا سفر کر رہی ہیں۔کیوں کہ بقول حسرتؔ موہانی:

شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

حقیقت میں شعر کا حسن یہی ہے کہ اس کے یہاں چیستانی کیفیت نہ ہو کر ایسی فضا ہو کہ ہر قلب و نظر جو ذرا سا بھی شعورِ سخن رکھتا ہے اس سے محظوظ ہو سکے ورنہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعر مقید زمان ومکان ہے۔ایسا کلام خال خال ہی دیکھنے کو ملتا ہے جس میں یہ طاقت ہو کہ وہ ہر طرح کے سامعین کو متاثر کر سکے اور انفرادیت کے ساتھ ادب کے تقاضوں پر کھرا اترتے ہوئے شاعر کی بقا کی ضمانت قرار دیا جائے۔

عصرِ حاضر میں ہزاروں آوازوں کے ہجوم میں ایک منفرد آواز جو نہایت متاثر کن نظر آتی ہے وہ ناظمؔ شکار پوری کی ہے۔موصوف کا تعلق شکار پور ضلع بلند شہر سے ہے اس سرزمیں سے ماضی میں بے شمار ادباء وشعراء نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور دبستانِ دہلی کے زیرِ سایہ ادب کو پروان چڑھایا۔عصرِ حاضر میں یہاں کی علمی فضا کی خوبصورتی برقرار رکھنے والوں میں ناظمؔ شکار پوری سرِ فہرست ہیں۔

ناظمؔ شکار پوری کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے اسلاف کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ان کے یہاں روایت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔جس سے ان کے شعور کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی موقف کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔آیئے اس نہج کے ان کے کچھ اشعار کا انتخاب کرتے ہوئے ان پر گفتگو کرتے ہیں جس کے تحت ہم کہہ سکیں کہ وہ روایت پسند ہیں؟ یا پھر روایت اور جدت طرازی کی آمیزش سے فنی جوہر دکھاتے ہیں؟۔سب سے پہلے وہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں خالص روایتی لفظیات کا استعمال آتا ہے۔مثلاً 'رقیب' 'زلفِ گرہگیر' 'گلِ تر' 'نسیمِ صبح' 'دام' 'مرغِ چمن' 'قمریاں'۔اشعار دیکھیں:

نہ جانے کون سے احساس نے کیا گونگا مرا رقیب تو اس درجہ بے زبان نہ تھا

اتنی قوت نہ کسی حلقۂ زنجیر میں ہے — جتنی قوت کہ تری زلفِ گرہ گیر میں ہے
گلِ تر ہو نہیں سکتا تھا وہ غنچہ گلستاں میں — جو آغوشِ نسیمِ صبح میں ٹھہرا نہیں ہوتا
دل گرفتارِ بلائے زلفِ جاناں ہو گیا — دام میں مرغِ چمن پھنس کر پریشاں ہو گیا
بھر بھر کے آہ، غم سے تڑپتی تھیں قمریاں — جب جب گھٹا نے ظلم کیا چاندنی کے ساتھ

ظاہر ہے ان اشعار میں 'رقیب' 'حلقۂ زنجیر' 'زلفِ گرہ گیر' 'گلِ تر' 'نسیمِ صبح' 'دام' 'مرغِ چمن' اور 'قمریاں' جیسے الفاظ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ ناظمؔ شکارپوری روایت کے حسن سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور اس کی جمالیات کی قدر و منزلت سمجھتے ہوئے اسے اپنی شاعری کا زیور بھی بناتے ہیں۔ ایک خاص بات اور اس سلسلے سے کہی جا سکتی ہے کہ اہلِ نقد و نظر جانتے ہیں کہ مذکورہ الفاظ آج کی شاعری سے یا تو تقریباً معدوم ہو چکے ہیں یا پھر نئے پیرائے اور الگ زاویئے سے اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں۔ لیکن موصوف کا اس ضمن میں کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان الفاظ کو اپنے حقیقی معنی میں پیش کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل کی اصل تصویر مجروح نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی وہ صنفِ غزل سے کھلواڑ نہیں کرتے یا اسے کسی طرح ضرب پہنچانے کا عمل انجام نہیں دیتے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ آج کی شاعری میں برائے نام غزل کا رنگ نظر آتا ہے۔ غزل اپنے حقیقی معنی و مطالب کے جامے سے نکل کر نہ جانے کس کس لباس کو زیبِ تن کئے ہوئے ہے اب یہ الگ بات کہ کچھ اس کو دیکھ کر لذت محسوس کرتے ہیں تو کچھ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ ناظمؔ شکارپوری کا کمال یہ ہے کہ وہ غزل کو غزل رکھتے ہیں اور اگر دیگر مضامین بھی اس میں شامل کرتے ہیں تو غزل سے ان کا رشتہ نہایت مربوط نظر آتا ہے۔ اس بات کو ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنے زمانے کی ادبی ہوا کے ساتھ بھی چلتے ہیں اور روایت کی خوشبو کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے رہتے ہیں۔ جس سے ان کی شاعری روایتی مضامین اور جدید لب و لہجے کا بہترین سنگم معلوم ہوتی ہے۔ اس دعوے کی دلیل میں کچھ اشعار دیکھیں:

مہ جبیں شہر میں ہیں اور بہت سے لیکن — میری چاہت نے فقط تیرا ہی درد یکھا ہے
اس کو دعویٰ بھی ہے محبت کا — حالِ دل سے جو آشنا بھی نہیں
شہر در شہر جو تحقیق ہوئی ہے ناظمؔ — راہزن سے بھی برے آج کے رہبر نکلے
محفل بھی ان کی کم نہیں روزِ حساب سے — مطلق یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں

ان اشعار کی لفظیات بھی روایت پسندی کی طرف اشارہ کرتی ہے لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان لفظیات کا یہاں نیا تیور ہے ان کا نیا رنگ و روپ ہے اور ان کے برتنے کا سلیقہ بتاتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں عصرِ حاضر کے منظر نامہ سے متعلق کیا کیا نکات گردش کر رہے ہیں۔ کیوں کہ ہر دور کے مہ جبیں سچے عاشق سے سرگرداں ہوتے ہیں اور عاشق پھر بھی ان کے در سے وابستگی اختیار کرنے میں عشق کی عظمت سمجھتا ہے۔ ہر دور میں ایسے افراد ہمارے حلقے میں ہوتے ہیں جو زبانی ہمدردی و محبت کے نقوش قائم کرنے میں ماہر ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں منافقت ان کا شعار ہوتی ہے۔ یہ بھی اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کسی مقصد کو لیکر چلنے والے غداری کرتے ہیں اور قوم کی رہبری کے بجائے اس کو گمراہ کر دیتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں انسانوں کا ہجوم ہونے کے باوجود ہر انسان تنہا نظر آتا ہے اور کسی کو کسی کی پرواہ نہیں۔ گویا کہ ان اشعار کی خوبی یہ ہے کہ روایتی قالب میں ڈھل کر بھی نئی آواز کے ساتھ محفلِ شعر و سخن میں اپنا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ بات پائے ثبوت تک پہنچ گئی کہ ناظمؔ شکار پوری روایت سے منقطع نہیں ہیں اور نہ ایسا ہے کہ وہ جدید شعور سے بیزار ہوں۔ بلکہ ان کے یہاں متعدد ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن سے ان کے زمانے کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ یعنی موصوف عصری حسیت کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ مثلاً آج کی زندگی پر غور و خوض کیجئے تو سینکڑوں مسائل درپیش ہیں اور ایک حساس قلم کار ان مسائل کے بیان سے کبھی تہی دامن نہیں رہ سکتا۔ آج کے مسائل میں جو پیش پیش ہیں ان میں بے گھری کا مسئلہ جا بجا نظر آتا ہے بڑے بڑے شہروں میں زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ لوگ سر چھپانے کے لئے پریشان رہتے ہیں اور راتیں فٹ پاتھ پر گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جس سے بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں۔ ناظمؔ شکار پوری اس کرب کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

گھر بنانا بہت ضروری ہے　　سر چھپانا بہت ضروری ہے

بے گھری و بے دری کے ساتھ ساتھ روزگار کا مسئلہ بھی عصرِ حاضر میں ایک بڑا مسئلہ بن کر سامنے آتا ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں نہ جانے کتنے افراد غربت کی زندگی گزار رہے ہیں ان کا درد ایک دردمند دل ہی سمجھ سکتا ہے جو ناظمؔ شکار پوری کے سینے میں دھڑکتا ہے اور ان کو شعر کہنے پر آمادہ کرتا ہے:

بھوکے بچوں کے تصور سے جگر کانپ گیا　　ایک مزدور کو جب وقت پہ اجرت نہ ملی

اسی مفہوم کو وہ اس طرح بھی بیان کرتے ہیں:

چھپا کے رکھیں کھلونے کہوا میروں سے کسی غریب کا بچہ مچل بھی سکتا ہے

ظاہر ہے شعر میں غربت کی تکلیف کے ساتھ امیروں کے مزاج اور بچوں کی نفسیات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناظمؔ شکارپوری کا تخیل بلند پرواز ہے بلکہ وہ ایک بڑے کینوس کے بھی شاعر ہیں۔آج کی زندگی کا مسئلہ تنہائی بھی ہے۔قدم قدم پر انسان خود کو تنہا دیکھتا ہے یوں تو اس کے چہار جانب ایک بھیڑ لگی رہتی ہے اور بظاہر وہ رات گئے تک محفل میں سرگرم عمل رہتا ہے لیکن اس کی تنہائی کبھی نہیں جاتی یہ تنہائی وہ گھر سے باہر ہی نہیں بلکہ گھر میں بھی محسوس کرتا ہے۔شعر ہے:

دیکھا ہے میں نے شہرِ خموشاں میں بیٹھ کر آبادیوں کے شہر میں تنہا ہے آدمی

آج کے دور کا المیہ یہ بھی ہے کہ بظاہر انسان کی صورت میں بہت سے نفوس ہمارے گرد و پیش میں نظر آتے ہیں لیکن ان کے یہاں انسانیت دیکھنے کو نہیں ملتی۔شعر ہے:

افسوس کا مقام ہے دورِ جدید میں انسانیت کے واسطے تشنہ ہے آدمی

اس دورِ جدید کی قیامت یہ بھی ہے کہ انصاف کرنے والا کوئی باقی نہیں۔منصف بھی بعض اوقات قاتل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔شعر ہے:

میرا قاتل ہی عدالت میں مرا منصف تھا اس لئے حق میں مرے کوئی شہادت نہ ملی

ہمارے دور میں منفی سیاست بھی ایک زہر کی مانند کارفرماء ہے جس سے انسانیت کو ناقابلِ برداشت نقصان ہوتا ہے لیکن عوام کا مزاج اتنا سادہ ہوتا ہے کہ وہ ذرا سی ظاہری ہمدردی پر اپنا ماضی بھلا دیتے ہیں۔شعر دیکھیں:

وہ جب بنا چکے ہوتے ہیں شہر کو مقتل پھر اتحاد کے پرچم اٹھائے جاتے ہیں

ایسا نہیں کہ سیاست صرف عالمی پس منظر میں ہی نظر آتی ہے بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود ہمارے احباب میں ہمارے ساتھ فریب کرنے والے موجود رہتے ہیں۔اپنے عزیز و اقارب ہی دل میں منافقت رکھتے ہیں اور ظاہر و باطن میں مختلف ہوتے ہیں۔شعر ہے:

پانی لئے کھڑا ہے وہ شخص روشنی میں تاریکیوں میں جس نے پھونکا ہے گھر ہمارا

ہر دور کی شاعری میں کچھ علائم و استعارے ہوتے ہیں جن کے توسل سے شاعر اپنے کلام کو ماورائے زمان و مکان بناتا ہے۔

مثلاً روایتی شاعری میں رقیب، زاہد، واعظ، رہزن، رہبر، عاشق، ساقی، پیر مغاں، ساغر، میکدہ وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ علامت کا عمل انجام دیتے تھے۔لیکن جدید لب و لہجے نے جیسے ہی اردو شاعری کے دھارے کو تبدیل کیا اس میں نئی علامتوں کا نہ صرف عمل دخل شامل ہوا بلکہ ایک تازہ کاری کا احساس بھی ہوا۔

آج کی شاعری کی علامتوں میں دریا، سمندر، تالاب، صحرا، پیڑ، مقتل، پیاس، سورج، رات، بادل، گلاب، خوشبو، چراغ، تتلی، کوئل، جگنو نہ جانے کتنے ایسے الفاظ ہیں جو نئے پن کے ساتھ اہل ادب کو متاثر کرتے ہیں۔ ناظم شکارپوری کی شاعری اس سلسلے سے بھی کامیاب ترین ہے کہ وہ اپنے دور کے علائم کا مکمل طور پر حق ادا کرتے ہیں اور انھیں نہایت خوبصورتی کے ساتھ برتتے ہوئے اپنے شاعرانہ مزاج کا سکہ دلوں پر ثبت کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کریں جن میں جدید علامتیں موجود ہیں:

دورِ حاضر کے گلابوں میں بھی نکہت نہ ملی ظاہری رنگ سے باطن کی حقیقت نہ ملی

بہتا دریا نہ سمجھ پایا قناعت کا مزاج پیاس ہونٹوں پہ ملی لب پہ شکایت نہ ملی

کہتی ہے کوّے سے کوئل میٹھی بولی بول کر خوش بیانی کو بنا اپنی محبت کا سبب

جو پتھر کاٹ کر بہتا نہیں ہے وہ اک تالاب ہے دریا نہیں ہے

اک کٹے پیڑ کو جب غور سے میں نے دیکھا، اس میں برباد پرندوں کے کئی گھر نکلے

ظاہر ہے پہلا شعر گلابوں کے پیرائے میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کے عمل اور دعوے میں افتراق ہوتا ہے۔ دوسرے شعر میں 'دریا' آسودگی کی علامت ہے اور 'پیاس' محرومی کی لیکن ساتھ ہی شاعر نے پیاس کی خودداری اور قناعت کا بھی قصیدہ پڑھا ہے جس سے علامت کا رنگ اور دوبالا ہو گیا ہے۔

تیسرے شعر میں 'کوا' اور 'کوئل' بطورِ علامت ان دو طرح کے افراد کی بات کرتے ہیں جن میں ایک وہ ہے جو تلخ گو ہے اور ایک وہ جو اپنی خوش بیانی اور دلکش نرم آواز سے لوگوں کے دلوں کو جیت لیتا ہے۔ چوتھے شعر میں 'پتھر' کسی منزل کے حصول میں سختیوں، دشواریوں اور رکاوٹوں کی علامت ہے جب کہ 'تالاب' محدود صلاحیتوں کے مالک کی صورت میں نظر آتا ہے۔ پانچویں شعر میں 'پیڑ' خاندان کے کسی ہمدرد اور سرپرست بزرگ کی علامت ہے جس کے ہونے کے سبب سے خاندان کی خوش حالی اور اتحاد قائم رہتا ہے۔

ہر دور کی غزل میں عشق کا جذبہ غالب رہا ہے۔ عشق ایک ایسی نعمت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا اور اگر کوئی منکرِ عشق ہے یا عشق کے کرشموں سے ناواقف ہے تو اس کے انسان ہونے میں شبہ ہوسکتا ہے۔ ناظمؔ شکار پوری بھی غزل کی اس روح یعنی عشق کو اپنی شاعری سے فراموش نہیں کرتے۔ وہ اپنی غزل میں ایک شوخ اور چالاک عاشق کا مکمل کردار ادا کرتے ہیں۔ مثلاً:

وہ ڈریں گے تو مجھ سے لپٹیں گے یوں ڈرانا بہت ضروری ہے

عشق عاشق کو تسلیم و رضا کی راہ پر گامزن رکھتا ہے اور سچے عاشق کی دلیل بھی یہی ہے کہ وہ محبوب کے حکم پر لبیک کہتا رہے۔ شعر ہے:

یہ تیرے پیار کی شدت نہیں تو پھر کیا ہے بغیر سوچے تری بات مان جاتا ہوں

لیکن ان کا عشق دورِ جدید کا عشق ہے اور اس عشق میں محبوب کی اطاعت کے ساتھ ایک قسم کی بیباکی بھی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی سچی تصویر کشی میں انھیں گریز نہیں۔ شعر دیکھیں:

گلے لگا کے مرے لب پہ اپنے لب رکھ کر مرے وجود کو پتھر بنا گیا کوئی

عشق کی ایک منزل خموشی ہوتی ہے تو ایک منزل محبوب سے تخاطب کی صورت میں بھی نمودار ہوتی ہے۔ یہ ہنر ناظمؔ شکار پوری بخوبی جانتے ہیں کہ محبوب سے خطاب کس انداز اور ادا سے کیا جاتا ہے۔ شعر دیکھیں:

تجھ سے مانوس ہوئی ہیں مری آنکھیں اتنی تیرا چہرا نظر آیا ہے جدھر دیکھا ہے

ظاہر ہے اس شعر میں بغیر کسی جھجک محبوب سے اظہارِ محبت کیا گیا ہے اور یہی آج کی جدید شاعری کا اندازِ سخن ہے کہ وہ دل کی بات لبوں پر لانے میں نہ دیر کرتی ہے اور نہ اس میں شرم و حیا کا کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ یہ تخاطب اس وقت اور بیباک اور پرتاثیر ہوجاتا ہے جب عاشق محبوب پر اپنا حق سمجھتا ہے:

اے مری راحتِ جاں اتنا بتا دے مجھ کو کیوں کئی دن سے میسر ترا دیدار نہیں

آج کا عاشق محبوب سے شکایت میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا اور وہ محبوب کو ایک طرح سے بددعا دیتا ہے۔ شعر ہے:

تو بھی فرقت کی اذیت سے بہت تڑپے گا کیسے بھولے گا مجھے روٹھ کے جانے والے

عاشق جب محبوب کی جانب سے ہجر کا شکار ہوتا ہے یا گردشِ زمانہ کے تحت اسے محبوب سے جدائی اختیار کرنی ہوتی ہے تو وہ ماضی کی یادوں کو کبھی نہیں بھولتا۔ ناظمؔ شکار پوری بھی ایسے ہی سچے

عاشق کی سچی تصویر کشی کرنے میں منفرد نظر آتے ہیں۔ کہتے ہیں:

تمہارے گھر کی گلی اور تمہاری یادوں میں مرا خیال مسلسل سفر میں رہتا ہے

وہ تنہائی کی اذیت کو بھی محبوب کی یادوں کے سہارے معدوم کر دیتے ہیں۔ شعر ہے:

ساتھ رہتا ہے مرے جب تیری یادوں کا ہجوم پھر مجھے ہو خوفِ تنہائی کبھی ممکن نہیں

وہ وارداتِ عشق کے بیان میں بھی یادِ ماضی کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں:

اک بار ان کو دیکھا تھا خلوت میں بے حجاب اتنا سا واقعہ ہے مگر مختصر نہیں

ان تمام اشعار کی قرأت کی روشنی میں ہم انھیں ایک سچے عاشق کی طرح دیکھتے ہیں لیکن ان کا عشق محض مجازی عشق نہیں بلکہ اس نوعیت کے ہر شعر کے پس منظر میں عشقِ حقیقی بھی اپنی جلوہ نمائیاں کرتا ہے۔

اردو غزل میں شعراء نے جہاں عشق کا ذکر کیا ہے وہیں اس کے ضمن میں محبوب کی ادا اس کا اندازِ سخن اور اس کے رویئے کو بھی بیان کیا ہے۔ اس سلسلے سے محبوب کو روایتی غزل میں جگہ جگہ ظالم قرار دیا ہے اور اس کی بہت سی خامیاں بیان کی گئی ہیں لیکن جو غزل گو شعراء جدید آب و ہوا میں سانس لیتے ہیں ان کا موقف اس سلسلے سے اعتدال پر منحصر ہے۔ ناظم شکار پوری کا بھی یہی خاصہ ہے وہ محبوب کی کمیاں نہیں گناتے بلکہ اس کی خوبیوں پر ان کی نگاہ رہتی ہے۔ وہ محبوب کی کم گوئی لائقِ مذمت نہیں بلکہ لائقِ تحسین قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

کچھ اس ادا سے اس نے کنائے میں بات کی حیران ہو کے رہ گئے اہلِ سخن تمام

لیکن اردو غزل سے محبوب کا شکوہ کبھی راہِ عدم اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لئے موصوف بھی اس شاہراہ پر گامزن نظر آتے ہیں اور سلیقے کے ساتھ اپنے محبوب کے حضور میں شکوہ بلب ہوتے ہیں۔ شعر ہے:

زندہ تھے جب تو پانی تلک کی خبر نہ لی اشکوں سے بعدِ مرگ بھگو یا کفن تمام

لیکن وہ نفسیاتِ محبوب سے بخوبی واقف ہیں انھیں معلوم ہے کہ ان کا محبوب رسوائی سے ڈرتا ہے۔ کہتے ہیں:

جو دور ہو تو کرے گفتگو وہ مجھ سے طویل قریب آ کے بہت اختصار چاہتا ہے

اس کے ساتھ ساتھ وہ محبوب کی سیمابی کیفیت سے بھی آشنا ہیں وہ محبوب کی پل پل بدلتی ہوئی فکر کی طرف بھی اپنی شاعری میں اشارہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

کماں پہ تیر چڑھا ہے نکل بھی سکتا ہے ارادہ کر تو لیا ہے بدل بھی سکتا ہے

یہاں صرف شعر محبوب تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق ہر اس انسان پر ہوسکتا ہے جس کے ارادوں میں پختگی نہیں پائی جاتی۔ یہی موصوف کی شاعری کا ہنر ہے کہ اس کے آئینے میں فقط ایک ہی صورت نہیں بلکہ سارے جہان کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔

انھیں انسانوں کی نفسیات سے بخوبی آگاہی ہے۔ دنیا میں مختلف مزاج کے افراد ہیں جن کی الگ الگ فطرت ہے۔ جب کسی حساس طبیعت کو ان سے گزند پہنچتی ہے تو وہ بظاہر خاموش رہتا ہے لیکن گہری تکلیف محسوس کرتا ہے۔ شعر ہے:

پہلے کرتا ہے وہ احسان و کرم کی بارش بعد میں لفظوں کے خنجر سے جگر کاٹتا ہے

ایک اچھا اور سچا شاعر وہی ہوسکتا ہے جس کے یہاں محض لفظی بازیگری نہ ہو کر کائنات کا گہرا مشاہدہ و مطالعہ پایا جائے۔ ناظم شکارپوری کا مشاہدہ قوی اور مطالعہ گہرائی و گیرائی سے ربط و تسلسل کا متحمل نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تجربات کی آنچ کی گرمی محسوس کی جاسکتی ہے۔ مثلاً وہ دیکھتے ہیں کہ جب رشتوں کے درمیان بدگمانی پیدا ہوجاتی ہے تو انسان عداوت کی انتہا پار کر دیتا ہے۔ شعر ہے:

بدگمانی جب کہ ہوجائے عداوت کا سبب وہ عداوت بن کے رہتی ہے ذلالت کا سبب

وہ محنت و مشقت کو زندگی کے لئے اشد ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں جو اس روش سے دور ہوتے ہیں وہ غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ شعر ہے:

انھیں جھلس دیا غربت کی دھوپ نے ناظم سروں پہ جن کے مشقت کا سائبان نہ تھا

لیکن وہ بھی دیگر صاحبانِ شعور کی طرح اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر انسان غلطی کر کے دوبارہ صحیح راستہ اختیار کرلے تو پھر اسے کامیاب ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ شعر ہے:

وہ زندگی کی راہ میں گرتا نہیں کبھی جو ٹھوکروں کے بعد سنبھلتا ہے آدمی

گویا کہ ان کی شاعری یاسیت پر مبنی نہیں بلکہ رجائیت کی نام لیوا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں قدم قدم پر ایک ولولہ، جوش، پر امیدی اور حوصلہ دیکھنے کو ملتا ہے جس سے ان کی مثبت فکر کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں:

یقیں رکھتا ہوں اپنی کوششوں پر مقدر کو کبھی پرکھا نہیں ہے
وہاں پر نصب ہے خیمہ ہمارا جہاں پر کوئی بھی ٹھہرا نہیں ہے

روشنی کے لئے اک جگنو بہت ہے مجھ کو میری راہوں کے چراغوں کو بجھانے والے

اگرچہ دل میں رواں تیرے عزمِ محکم ہو تو ریگزار سے چشمہ ابل بھی سکتا ہے

مندرجہ بالا اشعار اس بات کے گواہ ہیں کہ ان کے یہاں مایوسی نہیں بلکہ وہ نہ صرف حال بلکہ مستقبل کو بھی تابناک سمجھتے ہیں۔ اپنی اس فکر کی مزید ترویج وتبلیغ کے لئے وہ 'تلمیح' جیسی صنعت کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ اہلِ ادب جانتے ہیں کہ 'تلمیح' کی ہمارے ادب میں کیا اہمیت وافادیت ہے اور اس کے توسل سے کس طرح طویل داستانوں کو ایک شعر میں سمیٹ لیا جاتا ہے۔ کیوں کہ تاریخی واقعے اور قصے ہمارے عہد میں بھی وہی حیثیت رکھتے ہیں جو ان کی ماقبل زمانے میں وقعت تھی یہی وجہ ہے کہ ناظمؔ شکارپوری نے 'تلمیح' کا سہارا لیکر نہ صرف اپنی غزل کو خوبصورت بنایا ہے بلکہ اپنے کلام کو لامحدود بھی کر دیا ہے جس سے معنی آفرینی کا دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں:

میں عصرِ نو میں ہوں فرہاد جیسا مجھے دنیا نے پہچانا نہیں ہے

'فرہاد' یعنی 'کوہکن' جہاں سچی محبت کی علامت ہے وہیں سخت محنت ومشقت اور حوصلہ مندی کا بھی استعارہ ہے۔ یعنی موصوف جہاں محنت و مشقت کو محبت کا جزوِ لاینفک سمجھتے ہیں وہیں ہزار دشواریوں میں بھی حوصلے سے ہمکنار رہنے کا پیغام عام کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ عقل وخرد کو بروئے کار لانے میں ہی انسان کی زندگی کی کامیابی سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ اگر انسان فہم وذکاوت اور حکمت سے کام لے تو وہ کبھی فریب نہیں کھا سکتا۔ اس مفہوم کے لئے وہ 'جامِ جمشید' کی تلمیح استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

کوئی دھوکا نہ دے پائے گا مثلِ جامِ جم اکثر میں عقل وآگہی کو گوندھ کر ساغر بناتا ہوں

وہ حصولِ محبت کی محرومی سے بھی دل برداشتہ نہیں ہوتے کیوں کہ عصرِ حاضر کی شاعری اس عمل کی متقاضی نہیں۔ کہتے ہیں:

قیس وفرہاد کی تقدیر میں بھی وصل نہ تھا حوصلہ دیتی ہے فرقت میں یہی بات مجھے

ان کے یہاں عام طور سے مستعمل تلمیحات کا جادو ہے وہیں وہ ایسی تلمیحات بھی استعمال کرتے ہیں جنھیں بہت کم شعراء نے غزل کے دامن میں جگہ دی ہے مثلاً زبیدہ اور بہلولِ دانہ کی تلمیح۔ شعر ہے:

زبیدہ پھر کوئی آکر خریدے گی اسے ناظمؔ میں بہلولِ محبت ریت کا اک گھر بناتا ہوں

اس شعر میں ایک خاص بات اور متاثر کرتی ہے وہ ہے 'بہلولِ محبت' کی ترکیب۔ یہ ترکیب جہاں اچھوتی ہے وہیں نہایت جالبیت و جاذبیت بھی رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں درآئی تقریباً تمام تراکیب اسی طرح کی ہیں جن میں نیاپن اور تاثر کا فیضِ عام رواں دواں نظر آتا ہے۔ کچھ اشعار اس سلسلے سے پیش ہیں۔ کہتے ہیں:

وہ سلیقے سے مری فصلِ ہنر کاٹتا ہے — چھوڑ دیتا ہے اگر ہاتھ تو سر کاٹتا ہے

چراغِ عریاں جلاؤ تو اتنا دھیان رہے — تمہارا پھونس کا گھر ہے یہ جل بھی سکتا ہے

یہ مقتل تو نظر آئے کوئی رسوا نہ ہو جائے — میں تصویرِ شہیدِ عشق کو بے سر بناتا ہوں

دامنِ ضبط جلنے لگتا ہے — جب گراتی ہیں چشمِ تر آنسو

ابھریں گے بحرِ دل میں پھر یاد کے جزیرے — ان کی گلی سے ہوگا جب بھی گزر ہمارا

ان اشعار میں 'فصلِ ہنر' 'چراغِ عریاں' 'تصویرِ شہیدِ عشق' 'دامنِ ضبط' اور 'بحرِ دل' جیسی تراکیب زبان و بیان کی لذتوں کے سمجھنے والی افکار کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں کیوں کی ان میں جدت بھی ہے اور روایت کی پاسداری بھی ہے۔ یہ تو وہ تراکیب تھیں جن میں انوکھا پن بامِ عروج پر ہے وہیں ان کے یہاں وہ تراکیب بھی موجود ہیں جو قلم کاروں اور لکھاریوں نے اپنے یہاں عام طور سے پیش کی ہیں لیکن اس میں بھی ناظم شکارپوری انفرادیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اس سلسلے سے ایک شعر پر اکتفاء مناسب ہے۔ کہتے ہیں:

لاکھ دریائے محبت سامنے میرے بہے — پر بنا تیرے بجھے یہ تشنگی ممکن نہیں

شعر میں 'دریائے محبت' کی ترکیب آئی ہے ان سے پہلے بھی نہ جانے کتنے شعراء نے اسے اپنے یہاں جگہ دی ہے لیکن ناظم شکارپوری نے اس ترکیب کے استعمال میں اپنی منفرد صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔

جیسا کہ اب تک کی گفتگو سے ظاہر ہے کہ ناظم شکارپوری کی شاعری جدیدیت اور روایت کا بہترین امتزاج ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ان کے یہاں متعدد مقامات پر وہ عوامل بھی نظر آتے ہیں جو بہترین روایتی شاعری کے عکاس رہے ہیں۔ مثلاً ایسی صنعتوں کا استعمال جس سے شاعری خوب سے خوب تر رنگ و آہنگ اختیار کرتی ہے۔ ان میں تشبیہ، استعارہ، صنعتِ تضاد، سہلِ ممتنع کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی بھی سحر نگاری سے کام لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ شعر دیکھیں:

یہ ترا حکم بجالاتا ہے نوکر کی طرح — ایسا لگتا ہے مرا دل تری جاگیر میں ہے

ظاہر ہے شعر میں عاشق کو نوکر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اسی طرح استعارہ پر مبنی شعر ہے:

آستینوں سے مرے سانپ جو باہر نکلے پھر مری فکر سے تریاق کے جوہر نکلے

ظاہر ہے آستین کے سانپ دھوکہ اور فریب کرنے والے عزیزوں کا استعارہ ہیں۔ اسی طرح صنعتِ تضاد سے متعلق شعر دیکھیں:

اک تم کہ زندگی کے اجالوں میں کھو گئے اک میں جو کھیلتا ہوں ابھی تیرگی کے ساتھ

یہاں جہاں 'اجالوں اور تیرگی' میں صنعتِ تضاد ہے وہیں شعر کا انداز و اسلوب نہایت سادہ و سلیس ہے اور بلا شبہ سلاست بھی اردو شاعری کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ناظم شکار پوری کے یہاں یہ سلاست جسے ہم سہلِ ممتنع کا نام دیتے ہیں بیشتر مقامات پر پائی جاتی ہے۔ بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ جن کو سمجھنے میں ذرا سی بھی دشواری نہیں ہوتی اور اگر ان کی نثر بنائی جائے تو ایک لفظ بھی ادھر سے ادھر کرنے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً:

آنسوؤں کا سبب وہ پوچھتا ہے راز جس سے کوئی چھپا ہی نہیں

ان کے یہاں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ سامنے کی چیزوں اور روبرو کے ماحول اور فضا سے نیا مضمون نکالتے ہیں جسے اردو شاعری میں مضمون آفرینی قرار دیا گیا ہے۔ شعر دیکھیں:

چمن میں صبح کو شبنم سے باوضو ہو کر گلوں میں تیری طہارت کی بات ہوتی ہے

چمن میں پھولوں کا اوس سے نہانا ایک عام بات ہے لیکن اس عام بات کو خاص بنانے کا ہنر ناظم شکار پوری کے یہاں پایا جاتا ہے۔ یعنی انھیں گلوں پر شبنم کا عمل دیکھ کر محبوب کی طہارت و پاکیزگی یاد آتی ہے۔ ہر اچھے اور بڑے شاعر کی شاعری کی انفرادیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے قارئین کو گمراہ نہیں کرتی بلکہ عوام الناس کے لئے ایک پیغام عام کرتی ہے۔ یہ پیغام مختلف امور پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ مثلاً 'اصلاحِ معاشرہ' 'مساوات' 'جذبۂ ایثار' وغیرہ وغیرہ ناظم شکار پوری یہاں بھی کسی طرح کسی شاعر سے پیچھے یا کمزور نہیں ان کی شاعری میں پیغام علم و عمل کے ساتھ ساتھ دنیا کی تصویر کو خوبصورت سے خوبصورت بنانے کی تلقین ضرور ہوتی ہے۔ مثلا:

اپنے اعمال پہ کر پہلے نظر اے ناداں! بعد میں کہنا مجھے رزق میں برکت نہ ملی

کمتر جو دوسروں کو سمجھتا ہے آدمی وہ آدمی کے نام پہ دھبہ ہے آدمی

آدمی سب ہیں مگر انسان ہونے کے لئے آدمی میں جذبۂ ایثار ہونا چاہئے

ظاہر ہے ان اشعار میں ایک ایسا پیغام نظر آتا ہے جس پر عمل کر کے معاشرے کی بہت سی

برائیاں دور ہوسکتی ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ وہ خود احتسابی پر بھی زور دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اگر روح جاگتی ہے تو انسان کی زندگی کو کامیاب جانتے ہیں۔کہتے ہیں:

آئینۂ حیات پہ جس دم نظر گئی اس وقت میرے دل پہ قیامت گزر گئی

ان کی شاعری پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا سکتا ہے جس کے تحت ان کی تفہیم زیادہ سے زیادہ ہوسکتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کی یہ کتاب جسے وہ بعنوان 'منظرِ حیات' منظرِ عام پر لا رہے ہیں اس میں قارئین کو زمانے کے حقیقی مناظر کے ساتھ ساتھ ایک جہاں دیدہ فکر کی تصویر بھی نظر آئے گی۔مختصر طور پر کہا جائے تو الفاظ کو سمیٹتے ہوئے ناظمؔ شکارپوری کی شاعری پر یہ رائے دی جا سکتی ہے۔ان کی شاعری قاری کو نہایت متاثر کرتی ہے۔وہ قاری ایک عام قاری بھی ہوسکتا ہے اور ایک ناقد بھی جو ادب کی باریکیوں سے کما حقہ واقف ہے۔ان کی شاعری کے محل کی بنیاد روایت کی رہینِ منت ہے اور اس عمارت کے دیگر گوشوں اور منازل میں جدیدیت اور روایت کی ہم آہنگی اور ملے جلے رنگ نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو کسی بڑی شاعری کے لئے ناگزیر ہوتی ہیں۔ان کی شاعری میں جذبہ کی صداقت،سلاست و راوانی،تازہ کاری،مصرعوں کی بہترین بندش،منفرد اچھوتی تراکیب،مختلف صنعتوں کا ورود اور بلند پروازیِ تخیل کا احساس ہوتا ہے۔

Sandila: Qadeem Adabi Gahvara by Mohd. Yasub (Research Scholar
Dept. of Urdu KMCLU (Lucknow)

محمد یعسوب (ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ)

سندیلہ قدیم ادبی گہوارہ

علماء وصلحاء وادباء کی بستی سرزمین سندیلہ اپنی علمی ادبی وسیاسی خدمات کی بناپر چہارسومتعارف ہے۔قصبات اودھ میں سندیلہ ایسی بستی ہے جہاں کثیر تعداد میں علماء، شعرا، ادباء واہب العطا یانے عطا کیا اور عالمی سطح پر اپنی خدمات کے علاقہ کا نام روشن کیا خواہ دینی ہو یا دنیاوی جن میں سندیلہ کی آبرو مولانا حمد اللہ سندیلوی شارح مسلم، مولانا شوکت علی سندیلوی، مولانا باسط علی، مولانا عبدالعلی شوق سندیلوی، مولوی یوسف علی شیخ احمد علی ہاشمی، حکیم مولوی لطف رسول، مولوی ریاض الدین امجد، مولوی مقیم الدین، حکیم مولانا نواب علی برق، مولوی نذیر حسین فتنہ، مولانا حافظ عبدالرحمن قاسمی، مولانا اسحق سندیلوی وغیرہم کے علاوہ کافی تعداد ہے کہ اگر سبھی کا مختصر تعارف پیش کیا جائے تو مفصل کتاب تیار ہوجائے گی۔ یہاں کے علماء جنہوں نے عربی زبان وادب کے ساتھ فارسی واردو ادب میں کارنامے انجام دئے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں نام درج کرایا ہے وہ مفکرین جنہوں نے صرف اردو میں لکھا وہ بھی کم ازکم تین چار زبانوں پر قادر تھے۔عصر حاضر میں آج بھی سندیلہ میں علم وادب کے خادم اور علم وادب کے چاہنے والے ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔خواہ وہ برائے نام ہی کیوں نہ ہو۔سندیلہ میں بزم سلام کے نام سے ماہانہ نشست کا انعقاد ہوتا رہتا ہے جس میں خوش فکر وخوش گفتار شعراء شرکت کرتے ہیں۔سندیلہ میں اس سے قبل سہ روزہ مشاعرہ اور ہر روز قصبہ میں کہیں نہ کہیں شعری وادبی نشست منعقد ہوتی رہتی تھی۔آج بھی اکابرین کے علم وفضل کی روشنی وان کے فیوض وبرکات اہالیان سندیلہ پر سایہ فگن ہیں۔بزم سلام کے تحت ہونے والی نشست میں پڑھے جانے والے اشعار پیش خدمت ہیں:

نشست 27 جون 2021ء:

ایسی یہ آئی وبا کہ سب کو غمگین کرگئی جانے کتنے چل بسے ہیں شہر روتا چھوڑ کر سہیل سندیلوی

دوستوان کو فقط سر پر بٹھاتا ہے جہاں منزلیں سر کرتے ہیں جو عام رستہ چھوڑ کر ڈاکٹر زبیر صدیقی

راستے دشوار بھی ہموار ہوجاتے ہیں سب روز گھر سے نکلتا ہوں ماں کو ہنستا چھوڑ کر شمیم سندیلوی

مجھ کو اس چوکھٹ سے جانے کیسی نسبت ہوگئی ساقیا جاؤں کہاں درمیکدے کا چھوڑ کر اصغر ظہور بلگرامی

غیر کے پہلو میں مثل گل ہیں وہ جلوہ فگن ہجر کا کانٹا میرے سینے میں چبھتا چھوڑ کر داور رضا سندیلوی

نشست 26 جون 2022ء کے اشعار:

اب تکلف نہ کرو بس ہمیں رخصت کر دو
ان سے ہونی ہے ملاقات تمہیں کیا معلوم (ڈاکٹر زبیر صدیقی)

میرے قافلے سے الگ تھلگ میرے کارواں سے جدا جدا
وہ جگہ جگہ پر ملا مجھے، میرے راستے میں کھڑا ہوا (شمیم سندیلوی)

چمن کیا کہاں کا آشیانہ فقس ہے میری زندگی ہ (سہیل سندیلوی)

اتنا ہی زندگی کا وقفہ ہے دیر جتنی ہے ان کے آنے میں (ندیم سندیلوی)

مذکورہ اشعار میں دنیا کی بے ثباتی و بے زاری، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت ونسبت کے ساتھ ساتھ تجربات وحادثات کی نشاندہی اور ماں سے محبت سبھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پروفیسر عمر کمال الدین صدر شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی رقمطراز ہیں:

''اودھ کی تہذیب وثقافت اور علم وفضل کو عالمی شہرت بخشنے والی بستیوں میں قصبہ سندیلہ ممتاز حیثیتوں کا حامل ہے۔ لکھنؤ اور ہردوئی کے درمیان میں واقع یہ قصبہ جو گرد ونواح کی بستیوں میں ''شہر'' کے لقب سے معروف ہے جلیل القدر اولیاء کرام خدا رسیدہ مشائخ کرا، جید علماء وفضلاء، ماہرین فن، مورخین وتذکرہ نگاروں، مستند ومعتبر محققین ونقادوں، سحر طراز ادیبوں اور نامور شعراء کا وطن ہونے کے شرف سے مشرف ہے''۔ (حدیث بتاں، ص103)

سلطنت اودھ میں سندیلہ کی اپنی شان نرالی تھی۔ لکھنؤ کی طرح سندیلہ میں بھی شعر وسخن وادبی بزمیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ایک طرف مدرسہ منصوریہ تو دوسری طرف مدرسہ شوکت الاسلام وچھوٹے چھوٹے مکاتب اسلامیہ جن میں قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں بازگشت کرتی تھیں۔ طباعتی دشواری سے بچنے کی خاطر ایک پریس جو کوئن پریس کے نام سے قائم تھا لیکن اب نہیں۔ اس پریس نے نہ صرف شعر وادب بلکہ مذہبی کتب کی بھی خوب اشاعت کی۔ مظہر علی کا روز نامچہ یادرگا پرشاد مہر کی کتابیں تقریباً سبھی یہاں سے طبع ہو کر مقبول خاص وعام ہوئی ہیں۔ قصبہ کی معروف شخصیات التفات رسول سندیلوی جیسے ادب پرور سخن سنج عالم وسخن گستر نے مسلسل سہ روزہ کل ہند مشاعرہ کی بنیاد ڈالی اور شعرائے کرام کے تمام لوازمات وحق زحمت کا ذمہ خود لیتے جس میں استاد شعرا

کے ساتھ مقامی شعراء بھی شامل ہوتے تھے۔ مشاعرے میں شامل ہونے والے انور حسین آرزو، افضل لکھنوی، احسان علی خان احسان، سید حسین احمد بیباک شاہجہانپوری، بیخود موہانی، سید تہور حسین جادو رام پوری، محمد ضمیر خان دلشاہ جہاں پوری، سراج الدین احمد ساہل دہلوی، مرزا کاظم حسین محشر لکھنوی، مولوی معین الدین اختر بنارسی، حجاب شاہجہانپوری، فخر النساء وغیرہم حضرات تھے۔ بیرونی شعراء وادباء کا سندیلہ میں مسلسل قیام قصبے میں چہار سو بزموں کو آراستہ کرنے میں معاون ہوتا تھا۔ اور شب وروز ادب کی بزم منعقد ہوا کرتی تھی جس سے عوام الناس ان ادبی نشستوں ومجالس سے ادبی فیض حاصل کرتی۔ وطن کی تقسیم نے سندیلہ کی ہر رونق کو ختم کر دیا اور سندیلہ کی کثیر تعداد پڑوسی ملک پاکستان ہجرت کر گئی۔ ان میں علماء فضلاء، شعراء، ادباء سبھی تھے۔ یوں تو فرداً فرداً ہجرت کا سلسلہ اندرون وبیرون ملک جاری تھا لیکن بعد میں ہجرت کر کے واقعات زیادہ رونما ہوئے اور سندیلہ میں علم وفضل کی روشنی ٹمٹمانے لگی۔ لیکن بہر صورت کسی نہ کسی شکل میں بزرگوں کے فیوض وبرکات باقی ہیں۔ اولاً سندیلہ کا ماضی روشن اور تابناک تھا اور اب بھی مگر وہ بات نہیں۔

یوں تو سندیلہ میں اردو زبان وادب کے فروغ میں خوش نویسانِ سندیلہ، اکابرین علماء کرام رئیسوں اور حکمائے حاذق نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے ساتھ شعراء وادباء بھی کسی سے کم نہیں بڑھ کر حصہ لیا۔ جن میں شیخ احمد علی ہاشمی، فضل رسول واسطی، مولوی مقیم الدین دامانی، مولانا شوکت علی سندیلوی، مولوی مظہر علی سندیلوی، درگا پرشاد مہر، نورالحسن ہاشمی، عبد الستار صدیقی، شجاعت علی سندیلوی، عشرت علی صدیقی، عثمان علی ہاشیع، وجاہت علی سندیلوی، محمد شکیل احمد صدیقی، ڈاکٹر معین فاطمہ، اور شعرائے سندیلہ میں فضل رسول واسطی، نواب علی برق، ریاض الدین امجد ریاض، منشی مقبول احمد محو، منصب علی ہنر، حافظ منیر الدین منیر، صابر قدیری سندیلوی، وزیر حسن فتنہ، نشتر سندیلوی، نیاز سندیلوی، محمد احمد کوکب ودیگر شعراء جنہیں قدرت نے شعر وسخن کی صلاحیت ودیعت کی تھی ان کی خدمات سے آج بھی شعر وسخن کی روایت آج بھی قائم ہے۔

عصر حاضر کے قلمکاروں میں ضیاء فاروقی، ڈاکٹر سعید سندیلوی، ڈاکٹر صبیحہ انور بنت وجاہت علی سندیلوی، ڈاکٹر پروین شجاعت بنت ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ان میں اول الذکر کا قیام بھوپال مدھیہ پردیش میں اور بقیہ کا لکھنؤ میں ہے۔ اس وقت سندیلہ میں زبیر صدیقی صاحب قصبہ کی سابقہ روایت کے امین ہیں۔ آپ بزم سلام کے نام سے ماہانہ شعری وادبی نشست کا انعقاد انتہائی پابندی سے کرتے ہیں نیز ایک سالانہ کل ہند شاندار مشاعرہ کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ نشست میں

شریک ہونے والے بزم کے صدر چودھری نصرت علی، نائب صدر نعمان خان وکنوینر ڈاکٹر وید یاسر اسسٹنٹ پروفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ بزم کے سرپرست زبیر صدیقی صاحب جو اپنی سخن گستری سے قصبہ کے اندر منفرد ہیں ان کے علاوہ شعرا میں خود زبیر صدیقی صاحب جو ایک شعری مجموعہ ''حدیث بتاں'' رکھتے ہیں، عبد الولی سندیلوی ، سہیل سندیلوی، شمیم سندیلوی، ڈاکٹر وسیم سندیلوی وغیرہم سندیلہ کی شان وفخر سندیلہ ہیں جنہوں نے صدیوں پرانی روایت کو باقی رکھ کر علم وادب کی ضیا باقی رکھے ہیں۔ سندیلہ کے خوش ذوق واہل قلم نے سوانح اور کوائف سندیلہ بھی صفحہ قرطاس پر رقم کیا ہے اولاً اردو زبان میں نسب نامہ تحریر کیا اس میں سندیلہ کے مقتدرین وخود کے احوال زیب قرطاس کئے۔ یہ کتاب زبان فارسی میں تحریر کی گئی تھی۔

معروف شاعر وادیب فضل رسول واسطی مرحوم نے حالات سندیلہ کے نام سے سندیلہ کے مخدوم زادگان واپنے کوائف کو رقم کیا ہے۔ یہ سوانح عمری قلمی شکل میں ان کے خانوادے میں کسی کے پاس محفوظ ہے۔ سندیلہ کے معروف ومقبول رئیس اور جید عالم وفاضل مولانا شوکت علی بن چودھری مسند علی صاحب مرحوم نے ثمرات الانظار کے نام سے چار جلدوں میں اپنے خانوادے، اپنے اساتذہ وسندیلہ کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ ایک جلد ثمرات الانظار کی نورالحسن ہاشمی صاحب کے کتب خانے میں موجود تھی اب معلوم بقیہ اول دوم سوم جلدیں نایاب ہیں اور اب تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس کتاب میں مقتدرین سندیلہ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ اس کے بعد چودھری نصرت علی سکریٹری انجمن تعلق داران اودھ نے سوانحی کوائف واپنی خدمات کا ذکر نگار فاطمہ ہاشمی تحریر کرتی ہیں کہ ان کا سارا سرمایہ قلمی ہے۔ ازاں بعد کنور راجہ درگا پرشاد مہر سندیلہ کے معروف رئیس نے ''تاریخ سندیلہ'' کے نام سے کتاب ترتیب دی۔ نصف کتاب میں اپنے اور نصف میں سندیلہ کے اہم اور مقتدرین خاندانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ یقین احمد ہاشمی سندیلوی نے 1986ء میں ایک کتاب ''اخبار وانساب سادات سندیلہ'' کے نام سے شائع کروائی جس میں بالخصوص سادات سندیلہ خانوادوں کے شجرے وسندیلہ کے چند شعراء وادباء اور اپنے گھرانے کے حالات صفحہ قرطاس پر رقم کیا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا سید مظہر علی صاحب جو کہ مشہور ومعروف محقق ونقاد، شاعر وادیب کے دادا ہیں انہوں نے روزنامچہ تحریر کیا۔ یہ زبان اردو ادب کا طویل روزنامچہ ہے۔ اس کی تلخیص نورالحسن ہاشمی صاحب نے شائع کروائی ہے۔

Shakil-ur-Rahman ke Usloob ka mutala by Md. Halim (Research Scholar, Dept .of Urdu J.P. University Chapra

محمد حلیم (چھپرہ)

شکیل الرحمن کے اسلوب کا مطالعہ

اردو میں تخلیقی نثر لکھنے والوں کی روایت موجود رہی ہے لیکن ان میں سے کسی نثر نگار کے یہاں اسلوب کی وہ انفرادیت نظر نہیں آتی جس کی بناء پر اس کی علاحدہ شناخت قائم ہوتی ہے۔ مزید کہ اردو تخلیقی نثروں میں منطقی استدلال اور غور وفکر کے عناصر بھی کم نظر آتے ہیں۔ عام طور پر اردو کے تخلیقی نثر نگار سطحی تأثرات کو پیش کرنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے یہاں اکہرے پن در آتا ہے، ان کی نثر سے وہ حظ حاصل نہیں ہوتا، جو کسی عمیق غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس قسم کی نثر کو اکثر شاعرانہ نثر بھی کہا گیا ہے۔ شاعرانہ نثر سے مراد وہ نثر ہے جو محض مبالغہ آرائی پر مبنی ہوتی ہے۔ اور جس سے غور وفکر کی تحریک نہیں ملتی۔ حالاں کہ ادب کے کچھ مسائل سے تعرض کیا گیا ہے۔ اور ہمارے لئے محتاج توجہ ہیں۔ ادب جمالیاتی حسن کے اظہار کو کہتے ہیں۔ جمالیاتی رجحان میں حقائق کو صرف ضمنی حیثیت حاصل رہی ہے تو ظاہر ہے کہ اردو ادب ذوق جمال سے خالی ہے تو کسی بھی صنف میں شمار کی جاسکتی ہے۔ علم وادب کے آئینے میں کچھ ایسے اصناف ہیں جن کو تاریخ، جغرافیہ یا دیگر فنون میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور ادب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور اس سے ادب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جمالیاتی تأثرات کا ہونا ناگزیر ہے۔ ورنہ اظہار حقیقت مفروضہ سپارٹ بن کر ظاہر ہوگا اس لئے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ادب اور مورّخ یا دیگر فن کاروں میں بین فرق تصور کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبد الودود خاں کا خیال ہے کہ:

" تاثراتی اور جمالیاتی رجحان نے اردو نثر میں شاعرانہ نثر کو جنم دیا شاعرانہ نثر پہلے شبلی کی تحریروں میں پھر ناصر علی اور شرر کے عاشقانہ مضامین میں اور بعد میں یلدرم، مہدی، نیاز، ل احمد خلیق، مجنوں اور بہت سے دوسرے اہل قلم کی تحریروں میں نت نئے آہنگ سے نمایاں ہوئی۔ تاثراتی اور جمالیاتی اہل قلم ادب برائے ادب کے نظریہ کے حامل تھے۔ ا

اردو میں اس قسم کی تنقید لکھنے والوں میں آزاد، شبلی، مہدی، سجاد انصاری، عبد الرحمن بجنوری، فراق گورکھپوری، اثر لکھنوی، مجنوں گورکھپوری، رشید احمد صدیقی، نیاز فتح پوری محمد حسن عسکری

اور خورشید الاسلام وغیرہم کے نام آتے ہیں۔ اور ذوق جمال کے جذبۂ آہنگ کی آمیزش سے ادب کو پرتاثیر بنادیتے ہیں۔ معاشرہ کی جدوجہد سے انفرادی واجتماعی زندگی کو پیش کرتے ہیں۔ تو جمالیاتی رجحان کو واضح کرتے ہیں۔ اور پاکیزہ اسلوب بہتر سے بہتر عود کرتا ہے۔ اردو کے ان جمالیاتی یا تاثراتی نقادوں کی تحریروں سے بعض اقتباسات ملاحظہ فرمائیے آزاد کا لہجہ دیکھئے۔

"ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ و ہر رنگ میں اپنی ترنگ جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش وخروش سے لبریز نظم کے فروغ میں طبع آزمائی کی ہے۔ چند صفتیں خاص ہیں جن سے کلام ان کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ کلام زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست وگریباں ہے۔ جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی۔ بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دردبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں۔ گویا ولایتی طپنچہ کی چانپیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ۲

آزاد کے بعد شبلی کو بھی جمالیاتی وتاثراتی تنقید نگار کی حیثیت سے دیکھا جاتا رہا ہے ان کا سلوب آزاد سے اس معاملے میں بہتر ہے کہ اس میں علمیت کے واضح آثار بھی موجود ہیں اور خود شبلی کا تاریخی شعور بھی نمایاں نظر آتا ہے ان کی زبان اور فکری رویے میں حسین سلاست ہے۔ شبلی کے عالمانہ مقالات ومذہبی خطبات میں ادبیات فائقہ کا احساس ہوتا ہے۔ بلند خیالات کے لحاظ سے نازک تخیل میں لطافت پیدا کرتا ہے۔ اردو زبان عوام کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتی ہے۔ ہماری زندگی میں اہم کردار ہے۔ آزادئ ہند کی جدوجہد میں اہم رول ادا کیا ہے جس کی وجہ سے جمہوری تصورات ابھرنے لگے غالب کے خطوط کے مجموعے اردوئے معلیٰ اور عود ہندی ہے۔ تو سرسید کے رفقاء حالی، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، وقار الملک، اور محسن الملک کی کاوشیں بارآور ثابت ہوئیں۔ شعروادب کے رویّے کو ادب کی صف میں لاکر کھڑا کردیا۔ ملاحظہ فرمائیں:

"منطقی پیرائے میں اگر شعر کی تعریف کرنا چاہیں تو کہہ سکتے کہ جو جذابات الفاظ کے ذریعے سے ادا ہوں وہ شعر ہیں اور چونکہ یہ لفظ سامعین کے جذبات پر بھی اثر کرتے ہیں یعنی سننے والوں پر بھی وہی اثر طاری ہوتا ہے جو صاحب شعر کے دل پر طاری ہوتا ہے اس لئے شعر کی تعریف یوں بھی کرسکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات کو برانگیختہ کرے اور ان کو تحریر میں لائے وہ شعر ہے۔ شاعری کو جذبات ہی سے تعلق ہے اس لئے تاثیر اس کا عنصر ہے شاعری ہر قسم کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے کہ جو مناظر اثر انگیز ہیں شاعری ان کو پیش کردیتی ہے۔ ۳

یہ سچ ہے کہ شاعری حسن وتناسب کا احساس پیدا کرتی ہے۔ منطقی پیرایہ میں شاعری سحر انگیزی اور اثر انگیزی کی طرف راغب کرتی ہے۔ اس آئینے میں بے شمار الفاظ مستند و معتبر تصور کئے جاتے ہیں۔ شبلی نے ماضی کی شان وشوکت کو حال کی شدید کشمکش سے پیدا کی ہے شاعری تجربے کا خیال ہے قومی و آفاقی مشاہدہ کا موزوں اظہار ہے۔ شبلی نے فن تنقید کو فروغ دیا۔ موازنہ انیس و دبیر سے عمل کا راستہ متعین کیا۔ شعروادب کے نقطۂ نظر کو واضح کیا۔ جن کے موضوعات میں ہمہ گیری کی چاشنی ملتی ہے۔ شاعری اجتماعی شعور کے ارتقا میں بڑی اہمیت رکھتی ہے جس کے ذریعہ جذباتی ہم آہنگی اور کثرت میں وحدت کی کارفرمائی ہے۔ شاعری کے الفاظ تجربے کے اظہار ہوتے ہیں۔ ہر تجربے میں شعروادب کے جذبات اکثر بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ شبلی کے رشحات قلم نے نہ صرف تنقید کو بلکہ خود شعروادب کو متاثر کیا ہے۔ شعروادب کے آئینے میں ادب کی ہر تخلیق کی ابتدا تجربے سے ہوتی ہے۔ اس میں امتیاز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کے سلسلے میں ڈاکٹر شارب رودولوی نے یہ لکھا ہے۔

"موازنہ انیس و دبیر کے مطالعے سے بھی کسی حد تک ان کے تاثراتی ہونے کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان کی تنقید صرف تاثراتی ہی ہے۔ کیوں کہ وہ ایک گہرا تاریخی اور معاشرتی شعور بھی رکھتے تھے ان کی شخصیت کے کئی پہلو نظر آتے ہیں وہ ادب میں ایک طرف سیاسی ردو بدل کے اثرات دیکھتے ہیں تو دوسری طرف ذوقی جمالیاتی پہلوؤں کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ محاکات کی تعریف بھی شبلی کے یہاں جمالیاتی اظہار کی نمائندگی کرتی ہے۔ ۴

علامہ شبلی کی شخصیت قومی زندگی کی علمی تحریک سے وابستہ تھی۔ علم وادب کا تقاضہ ہے کہ ان کی علمی تحریک کا دارومدار جمالیاتی پہلوؤں کا اظہار تھا۔ انہوں نے ہر میدان میں انسانیت کی رہنمائی کی ہے۔ ان کے جذبات میں خلوص کا احساس تھا۔ اس دور کے افہام وتفہیم کے آئینے میں کچھ اثرات دیکھتے ہیں۔ اور ایسے جذبات سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس قسم کے جذبات اُس وقت بے حد موثر ثابت ہوتے ہیں جب ان کے رشحات قلم سے موت، حیات، تاریخ، تباہی، بیکرانی، آفاقی اور ابدی قسم کے خیالات ہوتے ہیں۔ اس رجحان کو تنقیدی قدر و قیمت میں شاید ایک نئے قسم کے اضافے کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے۔ کسی بھی جذبے کا عمل بذات خود مسرت بخش نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جذبہ جتنا شدید ہوگا۔ اتنی ہی مسرت حاصل ہوگی۔ ارباب علم وادب کا کہنا ہے کہ شاعری میں حسن و جمال سے زیادہ بہتر کوئی اور شئے نہیں ہوسکتی۔ شبلی کے نقطۂ نظر سے حسن جمال کی تعریف جمالیاتی نزاکت یا حسن کی رعنائی سے کی جاسکتی ہے۔ تنقید کی تاریخ میں افادیت کی مقصد بڑی اہمیت رکھتی

ہے۔تنقیدی ادب کی تاریخ میں نئے الفاظ کی ترکیب سے نئے قسم کے شاعرانہ خیال کا اظہار ہوتا ہے جس میں شک وارتیاب کا امکان نہیں ہوتا۔اس طرح جمالیاتی تنقید بھی متاثر ہوتے ہیں۔جس میں گہری بصیرت ہوتی ہے۔اس لئے شبلی کی ادبی تاریخ میں بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ بلکہ الفاظ کی جمالیاتی تقسیم کی بنیاد پر فوقیت ملتی ہے۔علامتی مفہوم کے سلسلے میں مہدی افادی کے اظہار کا رویہ ملاحظہ فرمایئے۔

''آج کل کے مصنفین میں علامہ شبلی کوایک خاص امتیازی فوقیت حاصل ہے جوان کے اورہم عصروں کے حصے میں نہیں آیا۔ان کے سخت سے سخت حریف مقابل بھی ان کی گرد کونہیں پہنچتے۔بعضوں نے موضوع سخن ایسا اختیار کیا کہ اگر زمانے کی رفتار یہی رہی تو زیادہ جیتے نہیں معلوم ہوتے۔نذیر احمد اپنی لاثق رشک عربیت کے ساتھ یونہی سے رہے یادش بخیر حالی نے مسدس کے ساتھ مقدمہ شعروشاعری اورحیات جاوید لکھ کر اپنا ٹھکانہ کرلیا''۔۵

علامہ شبلی کے جمالیات سے متعلق کچھ ایسے خیالات ہیں کہ سماجی معاشرہ میں انسانیت کا بے پناہ درد ہے۔ادب کی آماجگاہ میں فکری روش کی ہم آہنگی ہے۔جس میں ہر قسم کے مقامی رنگ کا اسلوب نمایاں ہے۔ان کی تنقیدی تصنیف میں دنیا کے تصور کا نظم وضبط ہے۔انہوں نے مختلف موضوعات پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔یہ بات حقیقت پر مبنی ہے۔ان کے ادراک عمل میں جمالیاتی پہلوؤں کا مبہم اعتماد ہے۔ان کی علمی تحریک میں خیالی صورت کی تجویزیں ملتی ہیں۔اور مبہم تخیئل کی رونمائی ہے۔تصور کے تانا بانا میں نئی نئی تاویلیں ملتی ہیں۔شعروادب کے دائرے میں خواہ رزمیہ شاعری یا غنائیہ شاعری ہی ہو۔شبلی بے حد تنقیدی سرچشمۂ نظام کا خیال رکھتے ہیں۔یہ حقیقت ہے کہ قوت شعری علم وعمل کا عطیہ ہے۔کہ شعروادب کی لطیف نغماتی ہم آہنگیوں کو مجروح نہیں کرتی بلکہ ارباب فن شبلی کے کمال کے معترف ہیں کہ انہوں نے رواداری اور وسعت قلبی کا درس دیا۔جس نے اسلوبی تنقید کے مکمل خط وخال کو پہلی بار اردو ادب میں اُبھارنے کوشش کی۔ان کے شائستہ لب ولہجے سے جذبات کی دنیا میں ہلچل پیدا کردی۔انہوں نے تخلیقی قوتوں سے نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ بلکہ وسیع معنوں میں طرز فکر کو بدل دیا۔اس دور میں نئے نئے مسائل پیدا ہوئے۔قومی اتحاد کا تصور ایک بنیادی فریضہ قرار دیا گیا۔جو علم وادب کے لیے نہایت دلچسپ اور فرحت بخش ہے۔عبدالرحمن بجنوری کے اسلوب کا جذبہ دیکھئے:

"مرزا غالب کی چشم بینا قدرت کو تمام نقاط نگاہ سے دیکھتی ہے اور ہر نظر میں ایک نیا جلوہ پاتی ہے۔مرزا

کے نزدیک ان کے اپنے خیالات کے مجسمات ہیں۔ان کو القا کے لئے سرو و چنار کو شب ماہ لب آب صحبت یار میں یا ساغر و مے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔مرزا غالب کی عبادت گاہ عرش و کرسی کے سائے میں ہے۔وہ تسبیح جس پر اسمائے الٰہی کا وظیفہ پڑھتے ہیں صد ہزار دانہ ہے اور وہ دانے اجرام فلکی اور اجسام سماوی ہیں۔جہاں عوام و خواص کا مذہب منتہی ہو جاتا ہے مرزا کا مذہب آغاز ہوتا ہے۔٦

برصغیر ہند میں چند زبانیں بولی جاتی ہیں۔جغرافیائی وسعت کے لحاظ سے یورپ کے چھوٹے چھوٹے ممالک کا مجموعہ ہے۔ہندوستان میں گونا گوں تہذیب،تمدن،کلچر،ثقافت،مذہب اور زبان موجود ہے۔شعر و ادب کے درمیان کسی ایک مرکزی خیال پر متفق ہونا آسان نہیں ہے۔عبدالرحمن بجنوری کی وسعت قلبی،اور فراخ دلی بے وجہ نہیں ہے یہ ان کی حکمت عملی اور پالیسی ہے۔اور زبان کا تصرف اپنی جگہ مسلم ہے۔اور فلسفۂ حیات کی تدبیر خود عقل و فہم کرتی ہے۔علم و ادب میں آفاقی تصور کی فطرت عقل سے ممکن ہے۔اور ہماری سمجھ کا قصور ہے۔کہ شاعری اپنی فطرت سے خود آراستہ ہے۔شاعری کے سوتے سرچشمۂ فطرت کی رہین منت ہے۔جمالیاتی تنقید کی بساط پر کوئی نئی فہم و فراست کی تجویز نہیں۔پھر بھی تنقید کی تاریخ میں اس کی اہمیت ہے۔مسائل تصوف کی جھلک آتشی سیال میں دیکھی جاسکتی ہے۔علم و ادب کی مجلس میں جام سفال کا دعوی کرنے والا شاید اپنی خوبی کا فیصلہ بھی کرتا ہے۔اگر مخصوص معاملہ ہے۔تو اس کے نظریے میں جز و کل کا اعتبار ممکن ہے۔کہ کب ہوش و خرد سے استفادہ کرلے۔امکان کا تعلق آسان نہیں۔اس کی تخلیق سے متاثر ہونا تکنیک کی تنقید ہے۔ادب کے مفہوم میں ذرا سی ترمیم پیدا کر دیتی ہے۔تو وہ اپنے مقصد کو حاصل کر لیتا ہے۔پھر بھی خواب گراں خیز کے مرحلہ میں اس کی تعبیر و تاویل کی جاسکتی ہے۔اور علم و ادب کا آغاز فیصلہ کن تصور کیا جائے گا۔تو عرش و کرسی کا وہم و گمان اس کے فکر و خیال سے وابستہ ہے۔

مخصوص حالتوں میں ناقد کا نظریہ غیر معمولی بیداری کا مظاہرہ ہے۔فکر و احساس کا مشاہدہ عمل کا متقاضی ہے،فکر و خیال کی سچی نشو و نما ماضی و حال کی شدید کشمکش سے پیدا ہوتی ہے۔اس کے اظہار میں طریقۂ حال ایک مخصوص بصیرت ہے۔احساس و ادراک کا فیصلہ قابل قدر کردار پر ہوتا ہے۔ظاہر ہے کہ خوبی کی پہچان فن کی ماہیئت پر ممکن ہے۔نیاز فتح پوری کا انداز نگارش دیکھئے:

" جس طرح ایک نقاش کا کمال یہ ہے کہ وہ خطوط کے امتزاج سے اصل منظر آپ کے سامنے لے آوے اسی طرح ایک شاعر کا کمال ہے کہ تاثرات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ان کو ایسے الفاظ و انداز سے ظاہر کرے کہ دوسرا بھی وہی کیفیت اپنے اندر محسوس کرنے لگے۔٧

شاعر کے تخلیقی تاثر کی خوبی داخلی عنصر پر ہے۔اس کی قابلیت کی اہلیت خوبی کے پرکھ پر ہے۔جب وہ کسی تاثر کو پرکھتا ہے تو اس کی عظمت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔اور اس کی افادیت مسلم سمجھی جاتی ہے۔عام طور پر یہ رائج ہے کہ قومی مرحلہ پر شعراء نے اپنا فریضہ انجام دیا۔کلام سے جذبات میں ہیجانی کیفیت پیدا کردی ہے۔اور قومی زندگی کا تصور سلوک کے آئینے میں عوامی تقاضوں کی ترجمانی ہے۔شاعری احساس کی عکاسی کرتی ہے۔شاعر قومی مفاد کا امین ہوتا ہے۔سرزمین ہند میں فکر وخیال کی معنویت قابل قبول شعروسخن ہے۔شعروادب کے اعتبار سے بہت قدیم ہے۔اثر لکھنوی کے یہاں تاثراتی رجحان بھی ہے۔اور ادب برائے ادب کے نظریہ کی طرف جھکاؤ بھی۔نئی ہیئتوں کی تلاش بھی ہے۔بلکہ وسیلۂ حیات بھی ہے۔احمد ندیم قاسمی کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"اب دو تین قطعات سن لیجئے جن میں شاعری زندگی اور ماسوائے زندگی سے بے نیاز ہوکر خود اپنی لطافتوں میں گم اور سرشار ہے۔جس میں زندگی سے ربط ہے مگر نہیں ہے، اور یہی شان ادب برائے ادب کی ہے جو آپ کو ایسی دنیا میں پہونچا دیتا ہے جہاں رعنائیاں آباد ہیں۔جہاں سرگلشن رنگ ورنگت سے بری ہے آپ اسے فراری ذہنیت سے تعبیر کیجئے۔میں آپ کی فطرت کے افلاس اور رنگینیوں سے محروم زندگی پر آنسو بہاؤں گا۔۸

اردو جمالیاتی تنقید کے سلسلے میں فراق گورکھپوری کا نام اکثر شامل کیا جاتا ہے خود ان کا تصور بھی تھا کہ تنقید جمالیاتی اور وجدانی معاملہ ہے۔تنقید سے ان کی مراد شاعر کے وجدانی شعور کا بھید کھولنا ہے۔انہوں نے اپنی تنقید کو خلاقانہ یا زندہ تأثرانہ تنقید بھی کہا ہے۔فراق کی بعض تنقیدی رائیں آفاقیت سے جدا نہیں کرسکتیں۔عقل وفہم کی کاوشیں دل تک پہونچاتی ہیں اور زمانہ آفاق کی منزل سے الگ نہیں کرسکتا۔اس کے باوجود موضوع کی افادیت گہرے جذبوں سے پیدا ہوتی ہے۔ملاحظہ فرمایئے۔

"اگر میر کے یہاں آفتاب نصف النہار کی پگھلا دینے والی آنچ ہے تو سودا کے یہاں اس کی عالمگیر روشنی ہے۔لیکن آفتاب ڈھل جانے پر سہ پہر کو گرمی اور روشنی میں جو اعتدال پیدا ہوجاتا ہے اور اس کی گرمی اور روشنی کے نئے امتزاج سے جو معتدل کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ مصحفی کے کلام کی خصوصیت ہے۔۹

اردو میں جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کے زیر سایہ تخلیقی تنقید لکھنے کا رجحان نمایاں رہا ہے۔لیکن جن چند نقادوں، بالخصوص خورشید الاسلام نے تخلیقی نثر کی جانب توجہ دی۔ان کا سارا زور اس پہلو پہ رہا کہ وہ اپنی نثر کو خوبصورت بناسکیں۔اس کی وجہ سے ان کے یہاں معنی کا اکہرا پن اور خیال کی

سطحیت در آئی ہے۔ان کے یہاں بسا اوقات معنی جامد نظر آتا ہے۔اوران کی نثر خیال آفریں نہیں ہو تی۔رشید احمد صدیقی، خورشید الاسلام کے برخلاف اپنی توجہ صرف نثر کی خوبصورتی پر مرکوز نہیں رکھتے ۔بلکہ معنی آفرینی اور مضمون آفرینی پر بھی خاطر خواہ دھیان دیتے ہیں۔لیکن تنقید کی وہ صورت ان کے یہاں بھی نظر نہیں آتی۔جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ نقاد کے تمام تر علوم وتجربوں کا نچوڑ ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف پروفیسر شکیل الرحمن بھی غالب کی عظمت کے قائل ہیں۔غالب کی عظمت کا احساس بھی ہے۔اردو کے دیگر نثر نگاروں یا تخلیقی تنقید نگاروں کے بہ مقابلہ پروفیسر شکیل الرحمن ایک وسیع اور ہمہ گیر تجربے کے پس منظر میں اپنی تنقید کو مرصّع بناتے ہیں۔ان متنوع تجربات کی نیرنگی اور ہم آہنگی ان کے اسلوب کی شناخت ہے جب وہ غالب کی شاعری کی عظمت بیان کرتے ہیں۔تو محض روایتی تا ثراتی انداز پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ اس جانب رجوع بھی نہیں کرتے۔ان کے تجربوں اور علوم کی ہما ہمی غالب کی شاعری کی تخلیق نو کرتی ہے۔جب وہ غالب کے اشعار پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ تجربات ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔

☆وسط ایشیا اور اسلامی ملکوں کی تہذیبی قدروں کی آمیزش کے جمالیاتی تجربوں کا تاریخی سفر اور تہذیبی مرکزوں کے جمالیاتی تجربے۔

☆ہندوستان تہذیب اور اسلامی تہذیب کی آمیزش اور اس کے جلوے۔

☆ہند مغل جمالیات کے داستانی طلسمات اور قدیم قصوں، حکایتوں، افسانوں، اور داستانوں کے ذخائر اور ان کی سحر انگیزیاں۔

☆ہند مغل جمالیات کی مصوری، نقاشی، صورت گری، موسیقی، رقص اور فن تعمیر کی جمالیاتی جہتیں۔

☆مابعد الطبیعاتی اور روحانی تصورات کی آمیزشوں کے جلوے اور مختلف علاقوں، زبانوں کے صوفی شعرا اور عوامی جذبوں کو مابعد الطبیعات تک لے جانے والے عوامی نغمہ نگاروں

☆مغل شعری اسالیب کی جمالیاتی عہد بابری سے بہادر شاہ ظفر کے عہد تک۔

☆ سبک ہندی کی سحر انگیزی جس سے ایران اور خراسان کے شعرا بھی متاثر ہوئے۔نظیری، عرفی، ظہوری، خسرو اور بیدل کے نگار خانے، صائب اور حزیں وغیرہ کے اسالیب کی جہتیں اردو کی جمالیاتی، تاثراتی یا تخلیقی تنقید ہی نہیں۔بلکہ اردو تنقید میں ایسی دیدہ ور کوئی شخصیت موجود نہیں۔جس کے ذہن میں بیک وقت اتنی باتیں موجود ہوں اور ان کے پس منظر میں تنقید لکھ رہا ہوں۔پروفیسر شکیل الرحمن کی تنقید میں انشائیہ کا اسلوب پایا جاتا ہے۔افسانوی رنگ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔اور شعر وادب کے

تجزیے میں بھی رنگ موجود ہے۔ انہوں نے اکثر و بیشتر حکایتوں کا بھی استعمال کیا ہے شکیل الرحمن کے اسلوب کی شگفتگی، اس کی عالمانہ سنجیدگی و وقار، اس کا داستانی رنگ، برجستہ اور بے ساختہ فقرے ان کے تجزیاتی انداز اور مختلف علوم پر ان کی دسترس حاصل ہے۔ بلکہ مخصوص حالتوں میں موزوں الفاظ کی ترتیب ہے۔ اور ہر لفظ کا معنی مجازی بھی ہے۔

حواشی و مآخذ

(۱) اردو نثر میں ادب لطیف ڈاکٹر عبدالودود خاں، ص ۶۶ / نسیم بکڈ پو لکھنؤ

(۲) آب حیات، محمد حسین آزاد ص ۲۵۲ /

(۳) شعرالعجم چہارم، مولانا شبلی نعمانی، ص ۳ /

(۴) جدید اردو تنقید اصول و نظریات ڈاکٹر شارب رودولی، ص ۲۹۵ / اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ

(۵) افادات مہدی، مہدی حسن خاں، ص ۷۷ /

(۶) محاسن کلام غالب، عبدالرحمن بجنوری، ص ۶۵ /

(۷) انتقادیات حصّہ دوم نیاز فتح پوری، ص ۱۶۷ /

(۸) چھان بین، اثر لکھنوی، ص ۵۶ /

(۹) اندازے، فراق گورکھپوری، ص ۴۹ /

☆☆☆

نظمیں Nazmein

Khalid Jamal (Varanasi)
cell-9838202248
خالد جمال (وارانسی)

یقینِ کامل Yaqeen-e-Kaamil

ہم نے جاڑے کی سرد راتوں میں
اپنے جذبوں کی آگ بھڑکائی
جسم و جاں کو حرارتیں بخشی
اس حرارت کا پیش خیمہ ہے
صبحِ نو کا یقینِ کامل ہے
سارا وہم و گمان باطل ہے

☆☆☆

خامشی Khamshi

نہ کتے ہیں
نہ بلی
گلی
سونی پڑی ہے
یہ کیسی
خامشی ہے

☆☆☆

سنہری روشنی Sunahri Roshni

فکر کے سارے دائرے
ایک دوسرے کو اوورلیپ کرتے ہوئے
سوچ کا ہر سرا
ایک دوسرے میں الجھا ہوا
ریشم کی نہ سلجھنے والی کرچی کی طرح
جذبوں کی آگ
سرد پڑتی ہوئی
بے نور ہوتے چراغوں پر
تیرگی، چھاتی ہوئی
کہیں دور سے آتی ہوئی
اک سریلی آواز
سبز رت کے گیت گنگناتی
میری منجمد سرشت میں
اک لہو سی پیدا کر دیتی ہے
اور
سیاہ رات
قطرہ قطرہ
ٹپک رہی ہے
صبح کا تارا دھندلانے لگا ہے
مشرقی افق ہر
سنہری روشنی
مچلنے کو ہے بیتاب

☆☆☆

Gul Jahan (Dera Ismail Khan)
گل جہاں (ڈیرہ اسماعیل خاں)

پتھر Patthar

اک دیوار میں دروازہ ہے
اک دیوار میں کھڑکی ہے
ایک طرف الماری ہے اور
ایک طرف وہ بستر جو
مجھ میں اور میرے خوابوں میں
واضح فرق برتتا ہے
وہ سوئیں تو میں جاگوں
وہ جاگیں مجھے جگائیں
چھت بھی کب سے ایک ہی رنگ کی
بس دیکھنے کا بوجھ اٹھائے
مجھ کو گھورے جائے
پنکھا بھی بہتر ہے مجھ سے
جب بٹنوں کا حکم ہو سر پٹ ایک سمت میں دوڑے
اب مجھ کو یہ خیال آتا ہے / آدھی عمر گنوا کے
کتنے استحکام سے ہر شئے اپنی جگہ بنائے
حکم سنے اور بوجھ اٹھائے / ایستادہ رہ پائے
میں کیوں اس دیوارِ جاں کی
اینٹوں کو سیلن لگا کر / روز ایک اینٹ اجاڑوں
آنکھوں کو نمناک ہی رکھ کر / کیوں غرقاب ہو جاؤں
اگر نہیں ہے جا انساں کی
پتھر ہی بن جاؤں ☆☆☆

Aslam Imadi(New Jersey)
cell-001-732-207-9739
اسلم عمادی (نیو جرسی، امریکہ)

پہلا حرف Pahla Harf

ابھی تو۔۔
میں نے اپنے نام کا
پہلا ہی حرف لکھا ہے
ابھی تو۔۔۔
میرا رنگ شہرِ خواب
میں چھپا ہے
ابھی تو۔۔
نرم نرم ہونٹ پٹریوں کی وحشتوں سے
زخم ہائے دل خراش، سے ملے نہیں
ابھی تو۔۔
پھول سی کٹوریوں میں شبنمی خبر ہے
صبح کی اداسیوں کی زردیاں نہیں
ابھی تو۔۔۔
خواب دیکھ لیں
اپنے نام کے ہر ایک حرف کو خوشنمائی سے لکھیں
☆☆☆

(2)

انگلیاں Ungliyan

پیراہنوں میں تیرنے لگتی ہیں پر ہوش
بے تاب انگلیاں
بے تاب انگلیوں کی قسم، دشتِ صد بلا
جسموں کے دائروں کو جھلستا ہوا رہے
اور سارے زندہ جسم
آنکھوں میں خون، چہروں پہ الفاظ جان لئے
آتے ہیں اس گلی میں ٹھہرتے ہیں۔!
چیخ کر ایک دھڑ دھڑاتی ریل گزر جاتی ہے تو
ہم۔
لاشیں شناخت کرتے ہیں

یہ لوگ کون تھے۔!
کس کے لئے عزیز تھے کس کے لئے رفیق
معصوم بچے قہر سے آزاد ہو گئے۔!
اور ان تمام لاشوں میں ہوتے ہیں ایسے چند
جن کے حسین ہونے کی دریافت کے لئے

پیراہنوں میں تیرنے لگتی ہیں
بے خبر
بے خبر
بے خبر انگلیاں۔۔۔!

میں فلسفوں کے شہر میں
سائل مزاج شخص
دیوار و در سے پوچھتا پھرتا ہوں
اے عزیز
کیوں آدمی کے خون میں تیزاب ہے بہت
برفاب ہے بہت۔؟

☆☆☆

(3)

رزمیہ کا درد Razmiya ka Dard

سفیدی کے کاغذ پہ میں
رزمیہ کی کہانی تو لکھتا نہیں ہوں
مگر یہ بھی سچ ہے
کہ کل جب سویرے کی آنکھیں کھلی تھیں۔۔
تو ہر اک طرف
خون ہی خون تھا
ذہن کے گھونسلوں میں پرندے بہت ڈر گئے تھے
مکانوں کے سر پہ کفن سرخ تھا
اندھیری ہواؤں کی آوارہ لہریں
ہر اک سبز پیکر پہ خونی فسانہ سنبھالے ہوئی تھیں
مگر آج جب
روشنی ٹوٹ کر آ گری ہے
تو اب عکس میں خوں کی رنگت نہیں ہے
تو اب خون آنسو بنا ہے۔۔۔! ☆☆☆

غزلیں Ghazlein

Khurshid Bismil Thanna Mandi
Rajouri, cell-9622045323
خورشید بسمل (تھنہ منڈی، راجوری)

آنکھ بھر کر وہ دیکھتا کب ہے
اب وہ روزن سے جھانکتا کب ہے

برف سی پڑ گئی ہے رشتوں پر
اب مری رہ وہ تاکتا کب ہے

لا ابالی سی گفتگو سب کی
تول کر کوئی بولتا کب ہے

رو رہی ہیں کتابیں شیلفوں میں
کوئی اب ان کو کھولتا کب ہے

بیچ کر گھوڑے سو رہے ہیں سبھی
کیا ہوا ؟ کوئی جاگتا کب ہے

بولتی بند کی موبائیل نے
پیار سے کوئی بولتا کب ہے

گرم محفل ہے مالداروں کی
کوئی بسمل کو پوچھتا کب ہے ☆☆☆

(2)

تلخ حالات کو ہر آن سہارا ہم نے
حالتِ جنگ میں ہر لمحہ گزارا ہم نے
طالع اوج پہ اپنے بھی کبھی ہوتے تھے
اب تو گردش میں ہی دیکھا ہے ستارہ ہم نے

جاں نثاروں کو کبھی پیٹھ نہ دکھلانا وطن
خونِ دل دے کے ترا حسن نکھارا ہم نے
تختۂ دار پہ چڑھ بیٹھے کبھی زہر پیا
تیری خاطر کیا ،کیا کیا نہ گوارا ہم نے

تخت تاراج ہوئے محل کھنڈر میں تبدیل
جا بجا دنیا میں دیکھا یہ نظارہ ہم نے
عدم آباد کو اب دیکھیں گے ہم تو بسملؔ
زندگی دیکھ لیا تیرا پٹارا ہم نے
☆☆☆

عجب انداز سے آئینہ دکھایا کس نے
رو برو آج مجھے خود سے کرایا کس نے
پہلے رعنائی ٔ گلشن سے مجھے باز رکھا
اور پھر قعرِ مذلت میں گرایا اس نے

مجھے گمنام سی منزل کا پتہ کس نے دیا
ایک انجان سے رستے پہ چلایا کس نے
میں تو آزاد فضاؤں کا پلا طائر تھا
مجھ کو انفاس کے زنداں میں بٹھایا کس نے
نخلِ امید ہرا دیکھا ہے میرا بسملؔ
روز خوابوں میں نیا خواب دکھایا کس نے
☆☆☆

Sohail Iqbal (Riyadh, K.S.A)
cell-00966-55-471-1667
سہیل اقبال (ریاض، سعودی عرب)

(1)

میں دام میں آ جاؤں گا ایسا نہ سمجھ لے
مجھ کو کوئی معصوم پرندہ نہ سمجھ لے

ڈوبا تو کناروں سے ابل آئے گا دریا
نادانی میں کوئی مجھے ہلکہ نہ سمجھ لے

غیروں سے یہاں اس لئے ہنس بول رہا ہوں
محفل میں کوئی مجھ کو اکیلا نہ سمجھ لے

تلوار کی، خنجر کی تو باتیں نہ کیا کر
دنیا یہ تجھے خون کا پیاسا نہ سمجھ لے

سر رکھ کے تو پتھر پہ بھی نیند آئے گی تجھ کو
گر تو اسی پتھر کو مرا شانہ سمجھ لے

شہروں میں تو تشخیص نہ ہو پائی مرض کی
شاید مری تکلیف کو ویرانہ سمجھ لے

تجھ سے نہیں درکار سند عقل و خرد کی
دیوانہ سمجھتا ہے تو دیوانہ سمجھ لے ☆☆☆

(2)

جب کہیں شہر میں ویران سڑک دیکھتا ہوں
اس میں برجستہ میں صحرا کی جھلک دیکھتا ہوں

منتخب کر ہی لیا تونے کسی کو شاید
آج کل میں تری آنکھوں میں چمک دیکھتا ہوں

وہ مرا دشمنِ جاں زخم لگاتا ہے مجھے
اور میں ہاتھ میں یارو کے نمک دیکھتا ہوں

کوئی کرتا ہے الزام تراشی مجھ پر
کچھ بھی کہتا نہیں بس سوئے فلک دیکھتا ہوں

تونے لگتا ہے بدل ڈالا عقیدہ اپنا
آج کل میں ترے ماتھے پہ تلک دیکھتا ہوں

کیا نہیں آتا نظر اپنے تخیل میں مجھے
بند آنکھوں سے بہت دور تلک دیکھتا ہوں

روز مئے خانے میں ساقی نیا آتا ہے سہیل
روز مئے خانے میں رندوں کی ہتک دیکھتا ہوں
☆☆☆

Dr. Bakhteyar Nawaz
(Varanasi) cell-9336900864
ڈاکٹر بختیار نواز (وارانسی)

کتنا بے رنگ ہے بھرم کا لباس
جب سے روشن ہے دورد وغم کا لباس
خوبصورت بدن ہے شیشے کا
کہکشاں ہے مرے صنم کا لباس
صاف شفاف دل بھی ہے کہ نہیں
یوں تو روشن ہے محترم کا لباس
مجھ سے ناراض ہو گئیں خوشیاں
میں نے پہنا نہیں جو غم کا لباس
زیب تن کون کر رہا ہے نواز
امن کے شہر میں ستم کا لباس

(2)

مرا جب بھی گماں روشن ہوا ہے
یقیں کے درمیاں روشن ہوا ہے
تمہارے لمس کا احساس اکثر
لہو کے درمیاں روشن ہوا ہے
ہیں جس کی منتظر آنکھیں ہماری
ابھی وہ سچ کہاں روشن ہوا ہے
زمیں پیروں تلے بجھنے لگی ہے
سروں پر آسماں روشن ہوا ہے
نواز اب خواب سے نکلو، کہ باہر
حقیقت کا جہان روشن ہوا ہے☆☆☆

(3)

لہولہان کبوتر ہوا میں اڑتا ہے
کہ اک نشانِ ستم گر ہوا میں اڑتا ہے
ہمارا خون کسی دن تو رنگ لائے گا
ہمارے قتل کا منظر ہوا میں اڑتا ہے
اسے زمین کی عظمت کا کچھ نہیں احساس
وہ ایک شخص جو اکثر ہوا میں اڑتا ہے
میں اپنی سوچ کے پر کاٹ دوں مگر پھر بھی
شعور و فکر کا لشکر ہوا میں اڑتا ہے
کئی دنوں سے ہے دہشت میں سارا شہر نواز
یہ کس کے ظلم کا خنجر ہوا میں اڑتا ہے

(4)

راستے میں چٹان اور بھی ہے
یعنی اک امتحان اور بھی ہے
میں ہوں اردو کا چاہنے والا
کوئی ایسی زبان اور بھی ہے؟
میرے منصف گواہیاں سن لے
میرے حق میں بیان اور بھی ہے
زندگی کی کٹھن مسافت میں
اک نیا امتحان اور بھی ہے
زخم تو خیر بھر ہی جائے گا
درد کی داستان اور بھی ہے
ناز مت کر اڑان پر تو نواز
اک نیا آسمان اور بھی ہے
☆☆☆

Urdu Afsano ki haiyat : Ekkeeswin Sadi mein by Dr. Ahtesam Alam

(Asst. Prof. (guest) dept. of Urdu, K.P. College, Murli ganj)

ڈاکٹر احتشام عالم (اسسٹنٹ پروفیسر (گیسٹ) شعبہ اردو کے پی کالج، مرلی گنج)

اردو افسانوں کی ہیت: اکیسویں صدی میں

اکیسویں صدی کے اردو افسانوں کی ہیت کی تبدیلی کے متعلق ایک بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ کہ جیسے کوئی بھی تبدیلی اس طور نہیں ہوتی کہ یک بہ یک سب کچھ تبدیل ہو کر بالکل ایک نئی صورت میں ہمارے سامنے آ جائے۔ ایسا زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح افسانوں کی ہیت میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں، وہ بھی سماج میں تبدیل ہوتے ہوئے معاشی، ذہنی اور دوسرے رویے جو ان سے منسلک تھے، ان کے زیر اثر ان کے بیان میں بھی وقت کی ضرورت کے اعتبار سے تبدیلیاں ناگزیر ہوئیں جن کو بہت سے اردو افسانہ نگاروں نے محسوس کیا اور اپنی تخلیق میں ان کو برتا۔ نئی صدی کے افسانوں پر گفتگو کرتے ہوئے مہدی جعفر لکھتے ہیں۔

"بیسویں صدی کے تخلیقی آہنگ کی گونج ہنوز قائم ہے۔ جن افسانہ نگاروں کے نام پیش منظر میں ابھرے ہیں، ان میں کئی پچھلی بازگشت میں شامل ہیں۔ کئی افسانہ نگاروں نے نمائندہ تخلیقات کی شرکت کے بعد کنارہ کشی اختیار کر لی۔ (قرۃ العین حیدر، قاضی عبد الستار، انور سجاد، مین را، بلراج کومل اور دوسرے) اور کئیوں کی تحریریں اوجھل سی ہو گئیں ہیں۔" (بحوالہ نئی صدی کے گردو نواح میں افسانہ، کتاب، نئے افسانے کی اور منزلیں۔ از۔ مہدی جعفر، ص 8)

اکیسویں صدی کے اردو کے اہم رسائل جن میں اس قسم کے بیشتر افسانے شائع ہوئے، کی بات کی جائے تو ان میں بعض مختلف وجوہات کی بنیاد پر اپنی خدمات مکمل کر کے بند ہو گئے جن میں شب خون اور ذہن جدید خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جو اہم رسائل و جرائد ہیں ان میں بقول مہدی جعفر اولیت انہیں ناموں کو حاصل ہے جو اردو فکشن کی آبیاری میں بیسویں صدی کے نمایاں اور مستحکم نام ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی نام ہیں جنہوں نے اکیسویں صدی کے ان سالوں میں نہ صرف اپنی شناخت مستحکم کی ہے بلکہ اردو فکشن کے آئندہ کے روشن مستقبل کی ضمانت بھی بن

گئے ہیں۔ان ضمن میں شب خون کے جنوری 2001 سے اس کے بند ہونے تک یعنی 2005 تک میں شایع ہونے والے شماروں میں جن افسانوں نے اردو فکشن کے آنے والے خوش نما مستقبل کی اساس فراہم کی ہے۔ان میں شفیع جاوید کا "رات شہر اور میں" شمارہ 245 مارچ تا جون 2001، زاہدہ حنا کا "رانا سلیم سنگھ" شمارہ 246 جولائی 2001 اقبال مجید کا "صغرا کا بلا 258 جولائی 2002 حسن جمال کا "بے وجود" 259 اگست 2002 سمیع آہوجا کا "بشو بنی مصطفےٰ" 263 دسمبر 2002 شفیع جاوید کا "تیز ہوا کا شور" 265 فروری 2003 ذکیہ مشہدی کا "قصہ ءجانکی رمن پانڈے" 266 مارچ 2003 مسعود اشعر کا "اپنا گھر" 269 جون 2003 اسد محمد خان کا "ماشٹر" 273 اکتوبر 2003 مبین مرزا کا "ریت کی دیوار کے ادھر" 274 نومبر 2003 محمد منشا یاد کا "ماں جی" 277 جنوری 2004 محمد حمید شاہد کا "سورگ میں سور" 278 مارچ 2004 قدیر زماں کا "گردش" اور رشید امجد کا "شب مراقبہ کے اعترافات" 280 مئی 2004۔ان کے علاوہ شب خون شمارہ 293 تا 299 جولائی تا دسمبر 2005 کے شمارے میں انتظار حسین کا "رشی اور قصائی" سید محمد اشرف کا "دلاوران نیم شب" عذرا عباس کا "میں اور موسیٰ" صدیق عالم کا "کا" ٹرمینس لین" خالد جاوید کا "مٹی کا تعاقب" محمد منشا یاد کا "چاہ در چاہ" مبین مرزا کا "قید سے بھاگتے ہوئے" آصف فرخی کا "نانو ہاؤس" رشی امجد کا "بے شناخت" محمد حمید شاہد کا "بدن برزخ" نسیم بن آسی کا "ندی پار کا شہر" ذکیہ مشہدی کا "سید کی حویلی" عبدالصمد کا "تیرہواں پتہ" اسلم فرخی کا "برصریر دل شاہم" اور محمد حامد سراج کا افسانہ" گھڑی، سمت، سوئیاں" ایسے ہیں، جو اردو فکشن کی قدر و منزلت کے ضامن ہیں۔

اسی طرح دوسرے موقر جرائد مثلاً "ذہن جدید" "نیا ورق" "شہرزاد" "روشنائی" وغیرہ سے مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔لیکن محض نام گنا دینے کی ضمن میں باقر مہدی نے لکھا ہے۔

"ہم عصر ادبی رجحانات کا مسلسل جائزہ لینا ناقد کے فرائض اولین میں شامل رہا ہے، مگر ہمارے مضامین نظموں، غزلوں اور افسانوں کی گنتی گنا کر رہ گئے۔"

(بحوالہ باقیات باقر مہدی، مرتب یعقوب راہی، ص 224)

میں سمجھتا ہوں کہ نام گنانے کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے اور ایسا نہیں ہے کہ کام نہیں ہوا ہے۔پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مرتب کردہ کتاب "نیا اردو افسانہ (انتخاب، تجزیہ اور مباحث) دلیل کے طور پر پیش کی جاسکتی ہے۔اس کے علاوہ بھی ہندوستان پاکستان سے دلائل فراہم کئے جاسکتے ہیں۔لیکن اس کے آگے فکشن کی شعریات کے آئینے میں تخلیقات کا جائزہ لینا اور کھرے کھوٹے کی

شناخت آگے کے درجات ہیں۔دوسرے معتبر جرائد میں شایع شدہ وہ افسانے جن میں اردو فکشن کو آگے بڑھانے کی صلاحیت موجود ہے، کی تعداد کثیر ہے اور ایک مضمون میں ان سب کا احاطہ ناممکن ہے۔ان کے لئے تو دفتر کے دفتر درکار ہیں۔تاہم افسانوں کی جدید ہیت پر غور کیا جائے تو کئی افسانے جدید کلاسک محسوس ہوتے ہیں اور جدیدیت کے رجحان کے اس مثبت رویے کی آئنہ داری کرتے ہیں جہاں افسانے کے ساتھ ساتھ اس کا عنوان بھی غور وفکر کے بعد سمجھ میں آجاتا ہے اور اس موضوع کا انسلاک بھی زندگی کی کسی نہ کسی مرئی حقیقت سے ہوتا ہے۔یعنی اب ان میں تجریدیت کی وہ پیچیدگی نہیں ہے جو ایک خاص قسم کے افسانوں کا طرہ امتیاز ہوا کرتی تھی۔

ایسے افسانے حاضر اور غائب راوی دونوں کے صیغے میں بیانیہ کی ان خصوصیات کا پیکر ہیں جنہیں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے" بیانیہ کی واپسی" سے تعبیر کیا ہے۔حال، ماضی اور پھر حال سے ہوتا ہوئے مستقبل کے اندیشوں کی پر تجسس غیر واضح نتیجہ اختتام پر مشتمل یہ افسانے انسانی نفسیات کی وہ مرقع کاری کرتے ہیں جو فکشن کو حقیقت اور حقیقت کو فکشن کی صورت عطا کرتے ہیں۔فکشن اور حقیقت کے متعلق وزیر آغا لکھتے ہیں۔

" حقیقت کیا ہے؟ اور فکشن کیا ہے؟ ان سوالات پر انسان ہمیشہ سے غور کرتا آیا ہے۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ" حقیقت" وہ ہے جس کا حواس خمسہ کے ذریعے ادراک ہوتا ہے۔بعض دوسروں کا خیال ہے کہ ہمارے حواس خمسہ حقیقت کی جو تصویر پیش کرتے ہیں، وہ بالعموم غلط یا ناقص ہوتی ہے۔نیز یہ کہ" اصل حقیقت" سامنے کی حقیقت سے ماورا ہے۔"

(فکشن اور حقیقت، مشمولہ معنی اور تناظر، از۔وزیر آغا ص، 71)

ادب بالخصوص فکشن میں حقیقت نگاری کی عکاسی کے لئے جو علامتی اور استعاراتی اسلوب سامنے آئے ہیں، انہوں نے مواد کی جزیات اور ان سے پیدا شدہ غیر متوقع نتائج کے ساتھ افسانوں کی ہیت میں مکالمہ، کردار، منظر کشی اور قصہ پن کے حوالے سے جو نئے امکانات پیدا کئے ہیں، وہ حقائق کے بھی کئی رخوں پر بہ یک توجہ کرتے ہیں۔ادب میں حقیقت نگاری کے متعلق وزیر آغا مزید فرماتے ہیں۔

" ادب کی صورت یہ ہے کہ اگر حقیقت نگاری یعنی Realism پر تمام تر توجہ مرکوز کر دی جائے تو تفصیل یعنی Detail اتنی گنجان نظر آئے گی کہ اس کے اندر کا منطقہ دکھائی ہی نہیں دے گا۔علامت نگاری کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ ظاہر کی ذہانت (یعنی تفصیل) کو کم کرتی ہے تا کہ اس کی

بنت کاری میں موجود چہرہ دکھائی دینے لگے۔تفصیل کے اندر گورکھ دھندا یعنی Labyrinth نیز گہراؤ اور قربت، یہ سب کچھ موجود ہوتا ہے، جس سے وژن دھندلا جاتا ہے جذبات کا بوجھ بھی وژن کے راستے میں ایک رکاوٹ ہے۔جب ظاہر کی تفصیل کو مدھم کر دیا جائے اور بوجھل جذبات نازک محسوسات میں تبدیل ہوجائیں تو ظاہر کی اندر سے حقیقت کی شبیہ جھلکنے لگتی ہے۔"

(ایضاً،ص78)

ایسے افسانوں میں ضمنی کرداروں کی نفسیات کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔سب سے بڑی خوبی یہ کہ راوی کا کوئی دخل ان افسانوں میں محسوس نہیں ہوتا۔یوں لگتا ہے کہ چند زندگیوں کے نشیب وفراز پر مشتمل واقعات وقت کے دھارے کے ساتھ بہتے چلے جارہے ہیں۔اکیسویں صدی میں کردار نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر حامدی کشمیری نے لکھا ہے۔

"جہاں تک کردار نگاری کا تعلق، کردار راوی کے اثر واقتدار سے بیش از بیش آزاد ہورہا ہے۔راوی کی زبانی اس کی جسمانی یا ذہنی خصوصیات کی تفصیل طرازی بے معنی ہوگئی ہے۔کردار اپنی نشوونما اور انفرادیت کے لئے بیان کنندہ کے بجائے واقعات کی نوعیت اور تعمیر پر انحصار رکھتا ہے، اور جن مقامات پر کردار کے حوالے سے بیانیہ ناگزیر ہو، وہاں بھی اجمال سے کام لینا لازمی ہے۔"

(اردو افسانہ امکانات کی تلاش، مشمولہ اردو افسانہ۔۔۔تجزیہ، از۔پروفیسر وہاب اشرفی، ص17)

افسانے کی نئی ہیت کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں سے اکثر میں اختتام کے سلسلے میں کوئی واضح نتیجہ کی جانب اشارہ نہیں ملتا بلکہ اس کے لئے ان الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے، جو قارئین کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں کہ اپنے اپنے طور پر اختتام کے نتائج اخذ کریں یا پھر اسی تجسس میں مبتلا رہیں۔اس طرح نئی افسانوی ہیت میں مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ ضمنی کردار بھی اپنی اہمیت کے اعتبار سے کبھی مرکز میں آجاتے ہیں، کبھی مرکز سے قریب تر ہوجاتے ہیں اور کسی بیان میں مرکزی کردار سے بھی زیادہ اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ نفسیاتی سطح پر افسانہ نگار ان کی تخلیق اس طور کرتا ہے کہ ایک استعجابی فضا سامنے آتی ہے جہاں کچھ بھی اس طور واضح نہیں ہوتا جو سپاٹ بیانیہ کی ذیل میں آتا ہے۔یہ نئی افسانوی ہیت کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔پروفیسر گوپی چند نارنگ نے نئی کہانی کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

"نئی کہانی نے اپنی سب سے بنیادی پہچان تصور حقیقت اور اظہار کے پیرایوں میں تبدیلی سے کرائی۔یعنی لفظ نرے لفظ نہیں تھے بلکہ ایسے استعاروں اور علامتوں کے طور پر استعمال ہونے

لگے ،جن کے مفاہیم کو منطقی طور پر Paraphrase کرنا ممکن نہیں۔فرد کی فردیت ،اس کے معمولی پن میں اس کی Uniqueness چھوٹے چھوٹے دکھ سکھ،اور بنیادی صداقتیں یعنی زندگی کی نوعیت اور ماہیت ،خوشی اور غم کی حقیقت ،وجود کا اختیار اور جبر ،جنس کی سچائی،عرفان ذات کی دہشت نیز طرح طرح کے موضوعات کی رنگارنگی کہانی کی دنیا میں اپنی کیفیت دکھانے لگی۔"
(نیا افسانہ:علامت ،تمثیل اور کہانی کا جوہر،مشمولہ،نیا اردو افسانہ،انتخاب تجزیے اور مباحث،مرتبہ ،گوپی چند نارنگ،ص46)

نارنگ صاحب کی بیان کردہ تمام خصوصیات اسلم جمشید پوری کے افسانہ" سایہ فگن دھوپ" جو کہ اپنے عنوان میں بھی سایہ اور دھوپ کے متضاد معنی ایک ساتھ رکھتا ہے، میں موجود ہے اور اسی قسم کے افسانے اردو فکشن کی دیر پا مقبولیت اور قدر میں معاون ہیں اس لئے کہ یہ عام اور خاص دونوں قسم کی زندگیوں سے جڑے ہیں۔ابواللیث جاوید کا افسانہ" چراغ کی لو" جو بیسویں صدی ،نئی دہلی کے جولائی تا دسمبر 2016 کے افسانہ نمبر میں شامل ہے۔خالد حسین کا افسانہ" ستی سر کا سورج" (واضح رہے کہ ستی سر سرینگر کا قدیم نام ہے) لمحے لمحے ،بدایوں کے نومبر 2013 کے شمارے میں جو کہ خالد حسین نمبر بھی ہے،شامل ہے۔نثار احمد صدیقی کا افسانہ" شوکیس" جو ماہنامہ تمہید،نظام آباد کے جون 2011 کے شمارے میں،ڈاکٹر سید نسیم بلخی کا "الٹی پلیٹ" ماہنامہ صورت کولکاتا کے شمارہ 11 میں،اشتیاق سعید کا "ہل جوتا" توازن ،مالیگاؤں میں، اقبال مجید کا" ایک زخم خوردہ چھپکلی" اور پروفیسر اسلم جمشید پوری کا" انجان راہوں کا مسافر" ماہنامہ آجکل نئی دہلی کے شمارہ مئی 2015 میں اور نند کشور وکرم کا" عرس کملے شاہ" جولائی 2015 میں،یونس جاوید کا" کن فیکون" ماہنامہ تخلیق لاہور کے اگست 2010 میں مشتاق احمد نوری کا " لمبے قد کا بونا" تحریک ادب شمارہ 31،اپریل تا جون 2017 میں ،وحشی سعید کا " عجب فطرت تھی اس کی" تحریک ادب شمارہ 25 اکتوبر تا دسمبر 2015 اطہر نیر کا نسل در نسل" دو ماہی سہیل،کولکاتا شمارہ مارچ تا اپریل 2014 سلام بن رزاق کا " راستہ" اور شموئل احمد کا" انڈے چرانے والی" سہ ماہی ابجد ،اررریہ،بہار شمارہ 15 جولائی تا دسمبر 2014 ،احمد ہمیش کا " روایت بے روایت" اور ڈاکٹر بلند اقبال کا " تمغۂ جرأت" جدید ادب ،جرمنی،جنوری تا جون 2009 وحشی سعید کا افسانہ" آسمان میری مٹھی میں" سہ ماہی لمحے لمحے ،بدایوں کے شمارہ جون 2015 جو کہ وحشی سعید نمبر میں شامل ہے۔

اس طرح اس سلسلے کو آگے بڑھایا جائے تو مزید طویل فہرست بن جائے گی ۔ایک اور

تبدیلی افسانوں کی ہیت کے متعلق یہ بھی دیکھنے میں آ رہی ہے اور اکیسویں صدی میں اس کا رواج زیادہ ہو گیا ہے، وہ ہے افسانچے کا۔ یعنی آسان لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ پہلے جس عنوان سے مختصر افسانے یا مختصر ترین افسانے تحریر میں آتے تھے، اب اس ہیت کا نام "افسانچہ" رکھ دیا گیا ہے۔ حالانکہ ابھی اس کی شعریات یا کوئی مستحکم شناخت نامہ وجود میں نہیں آیا ہے۔ محض اختصار کی بنیاد پر اسے افسانچہ کہا جا رہا ہے۔ یہ اختصار، مکالمہ، کردار، منظر یعنی افسانے کے تمام عناصر اور لوازمات میں موجود ہے۔ لیکن غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ اسی ہیت کے بیش تر افسانے وحشی سعید کے افسانوی مجموعے "کنوارے الفاظ کا جزیرہ" میں موجود ہے جن کی پہلی اشاعت 1975 میں ہوئی تھی۔ اسی طرح "رتن سنگھ کے مختصر ترین افسانے" کے عنوان سے بھی ایک کتاب موجود ہے۔ بہر حال افسانوں کی ہیت کے تعلق سے یہ تغیر خوش آئند ہے اور نئے امکانات کی بشارت دیتا ہے۔

☆☆☆

Akbar Allahabadi ki Shairi mein Tahzibi Tasaadum by Mahboob Alam
(Research Scholar, dept. of Urdu University of Hyderabad)
محبوب عالم (ریسرچ اسکالر: یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد)

اکبرالہ آبادی کی شاعری میں تہذیبی تصادم

ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اور تمام اصنافِ ادب اس کی تعمیر و ترقی میں اپنا اپنا مقام رکھتے ہیں۔ ادیب و شاعر جو حساس اور وقت کے حالات و کیفیات سے دوچار ہوتا ہے اور اپنے جذبات و خیالات اور محسوسات کو صفحہ قرطاس پر رقم کرتا ہے۔ شاعری ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس نے وقت کی تیز رفتاری اور بدلاؤ کے ساتھ اپنے دائرۂ عمل کو وسیع سے وسیع تر کیا اور دنیا کے تمام موضوعات کو اپنے قالب میں ڈھالا ہے۔ اکبرالہ آبادی اردو شاعری کی دنیا میں ایک ایسا نام ہے جو کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انھوں نے اپنے منفرد انداز اور اسلوبِ بیان سے اردو شاعری کو ایک نیا لب ولہجہ عطا کیا ہے۔ اکبرالہ آبادی نے اپنی منفرد شاعری سے اردو ادب کی دنیا میں ایک الگ مقام حاصل کیا ہے۔

سید گھرانے سے تعلق رکھنے والے اکبرالہ آبادی 16 نومبر 1846ء کو اتر پردیش کے ضلع الہ آباد کے قصبہ ''بارہ'' میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام سید اکبر حسین رضوی تھا۔ اکبرالہ آبادی ایک ذہین اور محنتی انسان ہونے ساتھ ساتھ پڑھنے کے بہت شوقین تھے۔ جس کے نتیجے میں انھوں نے خود مختاری کا امتحان پاس کیا، نائب تحصیلدار کے عہدے پر فائض ہوئے، وکالت بھی کی اور جج بھی بنے۔ سرکاری ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ اکبرالہ ابادی نے ملک میں موجود نئی تہذیب کے خدوخال اور اس کے منفی اثرات سے اگاہی حاصل کرتے ہوئے اسے روکنے کی ناکام کوشش کی۔ ملازمت کا پاس رکھتے ہوئے انھوں نے تمثیلی انداز کے ساتھ ظرافت کے پیرائے میں اپنے خیال کا اظہار کیا اور عرف عام میں فرنگی تہذیب و کلچر، تعلیم اور انداز فکر کے ساتھ ان کے طریقہ زندگی سے اگاہی اور مشرقی تہذیب و کلچر کا پاس اور اس کی فکر کے ساتھ اس کی حفاظت کرنے کا پیغام دیا۔ ہنسی ہنسی میں دل کی بات کہہ جانا ان کی لیاقت کا ائینہ ہے۔ انھوں نے خود کہا تھا کہ ''شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا

لحاف'' ال احمد سرور نئی تہذیب و کلچر کے انے سے سماج میں جو تبدیلیاں اور واقعات و حادثات پیش ارہے تھے اس کے تحت اکبرالہ آبادی کے فکر و خیال کا شعوری طور پر اپنی کتاب ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں لکھتے ہیں:

''اکبر کا خیال تھا کہ ہم کو اپنے کارناموں، اپنی روایتوں اور اپنی قدروں پر بھروسا کرنا چاہئے۔ اسی لیے وہ زمانہ کی رو کے خلاف کھڑے ہو کر اسے روکنے کی کوشش کرتے۔ وہ شبلی کی طرح پرانے نظام کو اچھا سمجھتے تھے اور اسی لیے نئے نظام کے ہر پہلو پر نکتہ چینی کرتے ہیں، نئی تہذیب و تعلیم کی خامیوں کو اشکار کرتے ہیں اور کسی قیمت پر بھی سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کسی چیز کو بھی نظر انداز نہیں کرتے اور معمولی سے معمولی بات کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اسی وجہ سے اکبر کی شاعری اپنے عہد کی لاجواب، جیتی جاگتی تصویر ہے اور اس عہد کی مختلف کشمکشوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔۔۔

یہ صحیح ہے کہ اکبر ایک تہذیب، ایک تمدن کے عاشق ہیں۔ وہ قدامت پرست ہیں اور نئی تہذیب، نئی تعلیم، نئے خیالات اور نئے اخلاق کے مخالف ہیں۔ ان کا خیال درست ہو یا نا درست، لیکن وہ نئی تہذیب کی ترویج میں تخریب کے اثار پاتے ہیں۔''

(کلیم الدین احمد: اردو شاعری پر ایک نظر، 65، 67)

مغربی تہذیب و کلچر کی آمد سے ملک میں رونما ہونے والے سماجی، سیاسی، تہذیبی، مذہبی امور اور اس کے تبدیلیوں کے سبب ذہنی تصادم نشوونما پا رہی تھی۔ اس شعر سے اکبرالہ آبادی کے عہد کی سماجی، سیاسی اور اخلاقی صورتِ حال کی عکاسی ہو جاتی ہے جو نئی تہذیب کے آنے سے ملک بھر کے ہر گوشے اور ہر حصے سے نظر آ رہی تھی۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

موجودہ مشینی اور تکنیکی دور میں دنیا جس رفتار سے ظاہری اور باطنی اتار چڑھاؤ، پیچ و تاب، زیر و زبر اور کشمکش و تذبذب سے گزر رہی ہے، اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر وقت ہمارا ذہن اس سوال کی جانب گردش کرنے لگتا ہے کہ ہماری سنسکرتی، تہذیب و کلچر، ہمارے آداب و معاشرت جسے ہم اپنے اخلاق اور شخصیت کی پہچان بتایا کرتے تھے اخر وہ کہاں گئے۔ وہ روایات جو ہماری پہچان ہوا کرتے تھے اور اس کے اثار اور وجوہات کیا ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سماج میں رونما ہونے والی تمام مادی مظاہر اشیا میں وقت کے ساتھ سماج اور افراد کی برابر کی حصہ داری ہوتی ہے۔ ہر شے تبدل و تغیر چاہتی ہے۔ مگر سماج ایک ایسا گہوارا ہے جس میں اچھے برے، ہر ضروریات اور خواہشات کے لوگ

زندگی بسر کرتے ہیں۔انھیں میں سے زیادہ تر افراد اپنی خواہشات کو دبائے ہوئے بنا کسی حرکت وعمل کے اپنی زندگی گزارتے جاتے ہیں لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہر وقت جدوجہد کرتے ہیں اور عوام کو متاثر بھی کرتے ہیں۔اس عہد میں انسانی خواہشات اور مادی ترقی نے ہر اچھی چیز کو پس پردہ ڈال دیا ہے۔انھیں چیزوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سموئل پی ہٹنگٹن نے یہ احساس کیا کہ اگر مستقبل میں کبھی بھی تصادم کے اثار نظر ائیں گے تو وہ تہذیبوں کے درمیان ہوگا۔دورِ حاضر کے دنیاوی حرکات وسکنات اور عوام کے اخلاقی وذہنی فکر وعمل کو دیکھتے ہوئے نیطشے کا یہ قول جو انھوں نے روح کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

''روح ایک زمانے میں خدا کا درجہ رکھتی تھی۔اس کے بعد وہ انسان ہوگئی۔اور اب تو اس کی حیثیت محض بازاری آدمیوں کی سی رہ گئی ہے۔''

صحیح ثابت ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔اس وقت ہر وہ شے جو اخلاق،تہذیب،محبت،عدل و انصاف، دوستی، ہمدردی،اپناپن، بھائی چارگی، دعائے خیر اور خوشی سے تعلق رکھتی ہے ناپید ہوتی جارہی ہے اسی لیے دنیا ایک طرف مادی نظریہ کی طرف جس تیزی سے بڑھ رہی ہے تو دوسری طرف پس منظر میں اسی رفتار سے ویران بھی ہورہی ہے۔اور مندرجہ بالا چیزیں اگر ہیں بھی تو اس کے پس پشت مقصدیت کا عنصر حائل ہوتا ہے یعنی مقصد کے تحت انسان حرکت وعمل کرتا ہے۔اس طرح نیطشے کا قول اس دور میں بخوبی انجام پارہا ہے۔

اکبر الہ آبادی کی تخلیقات کے مطالعے سے ان کے عہد کی عکاسی ہوجاتی ہے جسے اکبر الہ آبادی نے دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ان کی شاعری میں معاصر روئے وسماجی،سیاسی اور مذہبی تمام لوازمات کی فراوانی ملتی ہے۔اکبر الہ ابادی ایک ایسے حساس اور دردمند دل رکھنے والے شاعر تھے جنھوں نے اپنے منفرد اندازِ بیان اور اسلوب بیان سے تمثیلی پیرائے میں ہر وہ جذبات وخیالات کو بیان کر گئے ہیں جس سے اکثر ادیب وشاعر ڈرتے ہیں۔اکبر الہ آبادی ایک ایسے شاعر ہیں جو بنا ڈرے ہوئے حکومت کے خلاف آواز بلند کئے ہیں وہ بھی سرکاری ملازم ہوتے ہوئے اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اکبر الہ آبادی نہ صرف ذہین اور محنتی تھے بلکہ ایک بے باک اور بے خوف شاعری کی حیثیت سے بھی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔سید احتشام حسین اکبر الہ آبادی کے عہد اور ان کی شعری صلاحیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنی کتاب ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ''میں لکھتے ہیں:

''اکبر کا عہد ہندوستانی زندگی میں عظیم تبدیلیوں کا دور تھا اور اکبر کی بڑائی یہ تھی کہ انھوں نے اپنے وقت

کی مختلف اقسام کی جد و جہد کو شعوری طریقے سے سمجھنے کی کوشش کی اور چھوٹے بڑے سبھی واقعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ یہ ایک نئی قسم کی حقیقت پسندی تھی جس میں روز ہونے والی باتوں کو ظرافت اور طنز کا لباس پہنا کر خوبصورت نظم کی شکل میں انھوں نے کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔''

(سید احتشام حسین: اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ص ۲۳۲، ۳۳۲)

روایتاً اکبر الہ آبادی نے بھی اپنی شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے کی۔ وقت کی ضرورت اور حالات نے، مذہبی فرائض اور ایک ملکی ذمہ دار افراد کی ذمہ داریوں نے، سماجی اور انسانی ضرورتوں اور ان کے فرائض نے اکبر کو اپنے ذہنی و فطری حدود کو بڑھانے کے لیے بہت جلد ہی احساس قلب نے ان کے دہانے پر دستک دی۔ انھوں نے حصول مقاصد کے لیے غزل کے ساتھ ساتھ نظم، قطعہ، رباعی وغیرہ اصناف شاعری کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اکبر الہ آبادی ایک اصلاحی شاعر تھے۔ ایک شاعر کو اپنے جذبات و احساسات اور خیالات کی تبلیغ کے لیے، اور عام کرنے کے لئے دائرے محدود سے باہر نکلنا پڑتا ہے، اور مختلف انداز اختیار کرنے پڑتے ہیں، ساتھ ہی متعدد زبان و لفظیات بھی استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ اس معاملے میں اکبر کافی حد تک کامیاب نظر آے ہیں۔

اکبر الہ آبادی کو آخری ایام میں اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ جو ہمارا کام اور ہماری کوشش تھیں یہ وقتی اور سطحی تھی جس کی وجہ سے ان کی کوششیں ناکام ہوئیں اور نئی تہذیبیں اپنا قدم مضبوطی اور وقت کے دھارے کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی۔ انھوں نے اپنی شاعری میں مغربی تہذیب کے ان عناصر کو موضوع بحث بنایا جو منفی روئے کے متحمل تھے۔

اکبر الہ آبادی کی نگاہیں برطانوی فکر اور ان کے فکر کی ترویج کے الات بہت چبھتے تھے جیسے میڈیا اور صحافت جو مغربی سوچ کے دلدادہ تھے لیکن فرسودہ خیالات اور توہمات کے یہ بھی قائل نہیں تھے۔ اسی لیے انھوں نے کہا تھا کہ ''ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا'' کیوں کہ سر سید احمد خاں نے وقت کی نزاکت اور اس کی ضرورت کو بھانپتے ہوئے انھوں نے تہداری کے ساتھ نئی تہذیب و کلچر کے ساتھ ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہتے تھے۔ اکبر الہ آبادی نے اس چڑیا کی مانند سوچ و فکر کے ساتھ پوری سچائی اور ایمانداری سے کام کیا، جو جنگل میں لگی آگ کو یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک اکیلی جان اس جنگل کی آگ کو بجھا نہیں سکتی ہے پھر بھی وہ اپنی چونچ میں پانی بھر کر آخری دم تک کوشش کرتی رہتی ہے اور آخر کار دم توڑ دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اکبر الہ آبادی کے چند اشعار ملاحظہ ہو۔ جس میں انھوں نے ہندوستانی عوام کے لے اپنی شاعری اور اپنے مقصد حیات کو ظاہر کیا

ہے:

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

بے پردہ نظر آئیں جو کل چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو

لیکن ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

مندرجہ بالا اشعار سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اکبر الہ آبادی کو نئی تہذیب و کلچر کی افادیت و اہمیت کا احساس تھا، اور جو وقت کی ضرورت بھی تھی۔ لیکن انھیں اس بات سے شکایت تھی کہ یہ نئی تہذیب جو مغرب کی ایجاد کردہ ہے اس کے منفی اثرات میں مادیت اور انسانیت کی پامالی ہے۔ اس سے ہماری وراثت، ہماری تہذیب و کلچر اور اداب معاشرت ہم سے دور چلے جائیں گے۔ اسی لیے ان کی مقصد شاعری کا محور یہ تھا کہ ملکی عوام اپنی تاریخ کی یاد اور اس کے احساس کے ساتھ تکنیکی، مشینی اور مادی ترقی میں اگے بڑھیں۔ تا کہ ہمارے ابا و اجداد کی وراثت جو ہمیں ورثے میں ملی ہیں وہ بھی ہمارے ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائیں۔ ہم ایک ساتھ ترقی کی راہ میں گامزن ہوں۔ اس لیے انھوں نے اپنی شاعری کا مقصد ملکی عوام کی دبی ہوئی رگ میں خون بھرنے، ان کے احساس قلب کو جگانے، جھنجوڑنے اور حرکت پیدا کرنے اور مغربی تہذیب و کلچر کی خرابیوں اور کمیوں کو اجاگر کرنے کا الہ بنایا۔ تبھی وہ کہتے تھے کہ مغربی تہذیب کے آنے سے ہماری قابلیت یقیناً بڑھ گئی ہے، ہمارے وقت گزارنے اور سیر و تفریح کے نئے نئے سامان بھی مہیا ہو گئے ہیں، لیکن ہم انفرادیت اور خود پرستی کی جانب ایک اور قدم اگے بڑھ گئے ہیں۔ مگر اس تہذیب کے فتنے کا عالم یہ ہے کہ یہ دل اور دین کی باتیں ظاہری طور پر کرتی ہوئی نظر اتی ہے لیکن قلب مادیت میں ان کی دین سے دوری ہی مقصد ہے۔ جسے وہ بڑی تیزی سے حاصل کر رہے تھے۔ اسلام ہی اس دنیا میں ایک ایسا مذہب ہے جو ان کو اپنے مقصد حیات میں کامیاب ہونے سے روکتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کو یقین تھا کہ یہ سائنسی ترقی کتنی ہی آگے کیوں نہ بڑھ جائے، انسان ہواؤں میں اڑنے لگیں پھر بھی وہ خدا نہیں بن سکتے

ہیں۔ وہ ایک پتلے میں جان نہیں بھر سکتے ہیں۔ اسی لیے ان کا ہندوستانی عوام کو یہ پیغام ہوتا ہے کہ تم کالج میں پڑھو، گھومو، مشینی ترقی اور مادی ترقی بھی کرو لیکن اپنی حقیقت، اپنے کلچر اور تہذیب کو اور اپنی وراثت کے ساتھ ساتھ اس رب کائنات کو جس نے یہ دنیا جہان بنائی، اس کا ڈر، خوف، اس کا پاس اور اس کا لحاظ اور احساس بھی رکھو۔ ہم سچائی اور حقیقت سے منھ نہیں موڑ سکتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی کی پوری شاعری ہی اس مقصد حیات کی تکمیل ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکبر الہ آبادی کی شاعری میں نئی تہذیب اور ماضی کی تہذیب میں جو ممیزات و مفرقات تھے اس کی بنا پر انھوں نے اپنی شاعری میں انہیں تہذیبوں کے تصادمات کو پیش کیا ہے جس کے عوض یہ بات منعکس ہوتی ہے کہ ان کی شاعری میں تہذیبی تصادمات کے ابتدائی نقوش اشاروں اور کنایوں کے ساتھ ظاہری طور پر بھی نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

Maujooda daur mein Asateza talimi edaron ke B.Ed talib-e-ilm ke ilm aur maharat pe school internship programme ke asaraat :ek mutalea by Musarrat Faizi (Research Scholar) -Author-1, Dr. Fakhruddin Ali Ahmad (Asst. Prof.)- Author 2 (MANUU CTE-Darbhanga)

مسرت فیضی (ریسرچ اسکالر) ڈاکٹر فخر الدین علی احمد (اسسٹنٹ پروفیسر، مانو، سی ٹی ای، دربھنگہ)

موجودہ دور میں اساتذہ تعلیمی اداروں کے بی۔ایڈ طالب علم کے علم اور مہارت پہ اسکول انٹرنشپ پروگرام کے اثرات: ایک مطالعہ

• خلاصہ (Abstract)۔اس مطالعہ میں محققہ نے بی۔ ایڈ جماعت کے طلباء کے علم تدریس اور تدریسی مہارت پہ توجہ مرکوز کرتے ہوئے ان پہ اسکول انٹرنشپ کے اثرات معلوم کرنے کے لیے دو بی۔ ایڈ کالج اور چار سرکاری اسکول سے 100 طلباء اور انہیں میں سے 50 طلباء کا انتخاب کر کے نیم تجرباتی تحقیق کے طریقۂ کار کا استعمال کرتے ہوئے اپنے تحقیقی مقالہ کے مقاصد کی حصولیابی کی۔ جس کے لیے محققہ نے دو ٹول کی تشکیل کی اور اسکی مدد سے ڈیٹا حاصل کیا۔ تحقیق کے نتائج سے یہ پتہ چلا کہ اسکول انٹرنشپ پروگرام کا ان کے تدریسی علم اور مہارت پہ خاصہ اثر پایا گیا۔

• کلیدی الفاظ۔اساتذہ تعلیمی ادارہ، بی ایڈ طالب علم، اسکول انٹرنشپ پروگرام۔

• تعارف (Introduction)۔ یوں تو استاد کی اہمیت کو ہمیشہ سے ہی قبول کیا جاتا رہا ہے لیکن آج کے اس مادیت پسند دور میں ان کی ضرورت اور بھی اہم ہو جاتی ہے۔ اسکول اور کالجوں کے نصاب میں ان تمام پہلوؤں کو شامل کیا جاتا ہے جو طلباء کی ضرورتوں کو اور معاشی زندگی میں پیش آنے والی دشواریوں کا حل دلا سکے۔ معیاری تعلیم بھی دشکوں سے بحث کا مدّعا رہا ہے اور اس میں طرح طرح سے سدھار کیے جاتے رہے۔ ایسے میں، اگر کچھ اندیکھا رہ گیا ہے تو وہ ہے اقدار کی نشوونما۔ بچّے اپنے دن کا ایک بڑا حصّہ اسکول میں گزارتے ہیں، جہاں وہ اپنے معلّم کی نگرانی اور رہنمائی میں رہتے ہیں۔ اس لیے طلباء کی شخصیت سازی اور ان میں اقدار کی نشوونما کرنے کے سمت میں استاد کی

ذمّہ داری کافی اہم رول نبھاتی ہے۔

• ملک میں اساتذہ تعلیمی اداروں کے ذریعے ہر سال معلّم کی بڑی جماعت کو تیار کیا جاتا ہے ، جو اسکولوں میں اپنی خدمت دیکر سماج کی تعمیر میں اپنی حصّہ داری کو یقینی بناتے ہیں۔ اساتذہ تعلیم اس لیے بھی کافی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہ الگ الگ نوعیّت کے کورس کے ذریعے الگ الگ سطح کے اسکولوں کے لیے استاد تیار کرتا ہے۔ اس مقالے میں محققہ نے دوسالہ بی۔ ایڈ پروگرام کے طلباء کو اپنے اس تحقیقی مقالے کے مرکز میں رکھا ہے۔ تحقیق وہ عمل ہے جو انسان کو بصیرت دیتی ہے اور اختراعی تصوّرات کو جنم دیتی ہے۔ تحقیق کا مطلب ہے کچھ نیا کرنا، چیزوں کی تلاش کرنا اور کچھ مختلف کام کو انجام دینا۔ ایک تحقیق کار تحقیق کے عمل میں مختلف مرحلے سے گزر کر اپنی تحقیق کی مدد سے اپنے سوالوں کے جواب تلاش کرتا ہے اور لوگوں کو ان کے سوالوں کے حل ڈھونڈ کر دیتا ہے۔

• بی۔ ایڈ پروگرام کے ذریعے ثانوی سطح کے اساتذہ تیار کیے جاتے ہیں۔ این۔سی۔ٹی۔ای: اسکول انٹرنشپ فریم ورک اینڈ گائیڈ لائینس -2016 میں دوسالہ بی۔ ایڈ کورس کو تین حصّوں میں بانٹا گیا ہے؛ جس میں تھیوری، پریکٹیکل اور تیسرا فیلڈ انگیجمنٹ۔ تیسرا جزو سب سے اہم ہے کیونکہ اسی میں اسکول انٹرنشپ کو رکھا گیا ہے۔ انٹرنشپ پروگرام کی اہمیت اور ضرورت کو دیکھتے ہوئے اس کی مدّت میں اضافہ کیا گیا۔ اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ دوسال کی اس لمبی مدّت میں طلباء جو کچھ بھی سیکھتے ہیں، ان کو عمل میں لانے کے لیے انٹرن اسکول کی شکل میں انہیں ایک تجربہ گاہ فراہم کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جو سیکھا ہے اسے کس حد تک حقیقی زندگی میں کمرہ جماعت میں بہتر طریقے سے انجام دے سکتے ہیں۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ انٹرنشپ صرف کمرہ جماعت کی تدریس تک ہی محدود نہیں بلکہ اسکی وسعت بہت وسیع ہے۔ انٹرنشپ کے دوران طلباء کو ان تمام سرگرمیوں کو بھی انجام دینا پڑتا ہے جو اسے اپنے مستقبل میں پیشہ ورانہ زندگی میں کرنا ہے، اس لیے انٹرنشپ پروگرام مستقبل کے اساتذہ کو حقیقی اساتذہ بنانے کا اہم ذریعہ ہے۔

• مطالعہ کی اہمیت اور ضرورت (Need and Significance)۔ محققہ نے اپنے تحقیقی مقالہ کی تعمیر کے سلسلے میں اس سے منسلک مضامین اور مقالے کی نظر ثانی کی، اور یہ پایا کہ اسکول انٹرنشپ پروگرام کا بی۔ ایڈ طالب علم پہ خاصہ اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ پروین اور مرزا نے انٹرنشپ پر کیے اپنے مطالعے میں یہ پایا کہ انٹرنشپ پروگرام کا طلباء کی تدریسی مہارت اور انکے رویّے پر خاصہ اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس تحقیق میں یہ بھی پایا گیا کہ وقت کی کمی انٹرنشپ کی تاثیر کو منفی

طور پر متاثر کرتی ہے، اگر اس کی مدّت کو بڑھا دیا جائے تو یہ ٹرینی کے لیے اور بھی فایدمند ثابت ہوگا۔ اگروال نے اپنے مطالعے میں پایا کہ بیشتر طلباء کا انٹرنشپ پروگرام کو لیکر مثبت رویّہ ہے، انکا یہ بھی ماننا ہے کہ یہ پروگرام ٹرینی کے لیے کافی فاعدہ مند اور متاثر کن ہے۔ مختلف کمیٹی اور کمیشن نے بھی اس بات پر روشنی ڈالی کہ بی۔ایڈ کورس کی مدّت بڑھا دینا چاہیے اور انٹرنشپ کی مدّت میں بھی اضافہ کیا جائے تا کہ ٹرینی زیادہ سے زیادہ تجربہ حاصل کر سکیں۔

- مطالعہ کے مقاصد۔

1۔ بی۔ایڈ طالب علم کے تدریسی علم کا تدریس اور اکتساب کے حوالے سے مطالعہ کرنا۔
2۔ بی۔ایڈ طالب علم کے تدریسی علم کا اسکول کے نظم ونسک کے حوالے سے مطالعہ کرنا۔
3۔ بی۔ایڈ طالب علم کے کلّی تدریسی علم کا مطالعہ کرنا۔
4۔ بی۔ایڈ طالب علم کی تدریسی مہارت کا تدریسی معاون اشیاء کے استعمال کے حوالے سے مطالعہ کرنا۔
5۔ بی۔ایڈ طالب علم کی تدریسی مہارت کا ان کے تدریسی رویّے کے حوالے سے مطالعہ کرنا۔
6۔ بی۔ایڈ طالب علم کی کلّی تدریسی مہارت کا مطالعہ کرنا۔

- مطالعہ کے مفروضے۔

H01۔ بی۔ایڈ طالب علم کے تدریسی علم کا تدریس اور اکتساب کے قبل از اور بعد از امتحان کے اسکور میں کوئی نمایا فرق نہیں ہے۔
H02۔ بی۔ایڈ طالب علم کے تدریسی علم کا اسکول کے نظم ونسک کے قبل از اور بعد از امتحان کے اسکور میں کوئی نمایا فرق نہیں ہے۔
H03۔ بی۔ایڈ طالب علم کے کلّی تدریسی علم کا قبل از اور بعد از امتحان کے اسکور میں کوئی نمایا فرق نہیں ہے۔
H04۔ بی۔ایڈ طالب علم کی تدریسی مہارت کا تدریسی معاون اشیاء کے استعمال کے قبل از اور بعد از امتحان کے اسکور میں کوئی نمایا فرق نہیں ہے۔
H05۔ بی۔ایڈ طالب علم کی تدریسی مہارت کا ان کے تدریسی رویّے کے قبل از اور بعد از امتحان کے اسکور میں کوئی نمایا فرق نہیں ہے۔
H06۔ بی۔ایڈ طالب علم کی کلّی تدریسی مہارت کا قبل از اور بعد از امتحان کے اسکور میں کوئی نمایا

فرق نہیں ہے۔

- تحقیقی خاکہ (Research Design)۔اس مقالہ کو مکمل شکل وصورت تک پہنچانے کے غرض سے محققہ نے نیم تجرباتی ڈیزائن کا استعمال کیا، کیونکہ یہ ڈیزائن حقیقی تجرباتی ڈیزائن سے تقریباً ملتا جلتا ہوتا ہے۔ بطور آبادی محققہ نے بہار میں واقع ضلع دربھنگہ کے تمام بی۔ایڈ کالج اور نمونے کے لیے دربھنگہ شہر کے دو بی۔ایڈ کالج (فخر الدین علی احمد ٹیچرس ٹریننگ کالج۔جیو چھ گھاٹ اور ایل۔کے۔مشرا۔بی ایڈ کالج۔دلّی موڑ دربھنگہ) سے 100 طالب علم کے ایک گروہ کو رینڈم سیمپلنگ ٹکنیک کی مدد سے منتخب کیا، پھر انہی 100 میں سے 50 طلباء کو 4 سرکاری اسکولوں میں جا کر مشاہدہ کیا۔ نتائج کی حصولیابی کے لیے محققہ نے دو تحقیقی ٹول کو تشکیل دیا۔جس میں ایک سوالنامہ اور ایک مشاہداتی شیڈیول تھے۔سوالنامے کا مقصد بی۔ایڈ اسٹوڈینٹ کے علم کو معلوم کرنا اور مشاہداتی شیڈیول کا مقصد انکی مہارت پر اسکول انٹرنشپ کے اثر کا پتہ لگانا تھا۔محققہ نے تحقیقی سوالنامے کی معتبریت اور معروضیت نکالی۔سوالنامے میں 74 items رکھے جبکہ مشاہداتی شیڈیول میں 36 items رکھے، اسطرح سے محققہ نے ٹول کی تشکیل کے مختلف مرحلے کو باقاعدگی سے مکمّل کر کے اپنے دونوں ٹول کی تعمیر کی۔
- تجربہ کا عمل۔محققہ نے پہلے تو منتخب کالج سے معتیات حاصل کرنے کی غرض سے کالج کا دورہ کیا۔پھر ڈیٹا لینے کے لیے کالج جا کر وہاں کے پرنسپل سے بی۔ایڈ کے طالب علموں سے ملنے کے لیے انکی جماعت میں جانے کی اجازت مانگی۔کلاس میں داخل ہونے کے بعد طالب علموں سے مخاطب ہوی، انکو اپنا تعارف پیش کیا۔پھر ان سے بات چیت کی اور انکو یقین دلایا کی ان سے ڈیٹا حاصل کرنے کا سبب محض اپنے مطالعے کے مقاصد کو معلوم کرنا ہے اور باقی اس میں حاصل جانکاری کو کسی دوسرے کام میں استعمال نہیں کیا جائے گا۔پھر سبھی طلباء سے ڈیٹا لیا گیا، اسطرح سے محققہ نے اپنے سوالنامے کی مدد سے ڈیٹا جمع کیا۔اسکے بعد جب یہی طلباء اسکول میں انٹرنشپ کے لیے گئے تو محققہ نے انکی تدریسی مہارت کا مشاہدہ کرنے کے لیے چار اسکول سے انہیں 100 میں سے 50 کو مشاہدہ کے لیے چنا، پھر وہاں کے ہیڈ ماسٹر سے اجازت لیکر انکی کلاسیز میں جا کر انکا مشاہدہ کیا۔ اسطرح سے محققہ نے اپنے دونوں تحقیقی ٹول کی مدد سے اپنے تحقیقی مقالے کو انجام تک پہنچایا۔
- شماریاتی تکنیک کا استعمال۔اس مطالعہ میں محققہ نے موجودہ مطالعے کے مقاصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے مفروضوں کی تصدیق کرنے کی غرض سے محققہ نے پیرڈٹی۔ٹیسٹ کا استعمال کیا۔

- ڈیٹا کا تجزیہ وتشریح۔

.1. بی۔ایڈ طالب علموں کے تدریس اور اکتساب کے حوالے سے انکے علم تدریس کے پہلے اور بعد کے اسکور واضح فرق دیکھنے میں آیا، جس کی بنیاد پہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صفر مفروضہ " بی۔ایڈ طالب علم کے تدریسی علم کا تدریس اور اکتساب کے قبل از اور بعد از امتحان کے اسکور میں کوئی نمایا فرق نہیں ہے " کو مسترد کیا جاتا ہے اور اس نتیجہ پہ پہنچا گیا ہے کہ ان کے علم تدریس کے حوالے سے تدریس اور آموزش میں خاصہ اثر پایا گیا ہے۔

2۔ بی۔ایڈ طالب علموں کے اسکول مینجمنٹ کے حوالے سے انکے علم تدریس کے پہلے اور بعد کے اسکور خاصہ فرق دیکھنے میں آیا، جس کی بنیاد پہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صفر مفروضہ " بی۔ایڈ طالب علم کے تدریسی علم کا اسکول مینجمنٹ کے قبل از اور بعد از امتحان کے اسکور میں کوئی نمایا فرق نہیں ہے " کو مسترد کیا جاتا ہے اور اس سے یہ نتیجہ حاصل کیا گیا ہے کہ ان کے علم تدریس کے حوالے سے اسکول مینجمنٹ کی صلاحیت میں خاصہ تبدیلی آئی ہے۔

3۔ بی۔ایڈ طالب علموں کے کلّی علم تدریس کے پہلے اور بعد کے اسکور سے اہم فرق دیکھنے میں آیا، جس کی بنا پہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ صفر مفروضہ "بی۔ایڈ طالب علم کے کلّی تدریسی علم کا انکے قبل از اور بعد از امتحان کے اسکور میں کوئی نمایا فرق نہیں ہے " کو نکارا جاتا ہے اور اس نتیجہ پہ پہنچا گیا ہے کہ ان کے کلّی علم تدریس میں کافی مثبت اثر پایا گیا ہے۔

4۔ بی۔ایڈ طالب علموں کے تدریسی معاون اشیاء کے استعمال کے حوالے سے انکی تدریسی مہارتوں میں حیرت انگیز تبدیلی دکھی ،اور یہ ثابت ہوا کہ صفر مفروضہ "بی۔ایڈ طالب علم کی تدریسی مہارت کا تدریسی معاون اشیاء کے استعمال کے قبل از اور بعد از امتحان کے اسکور میں کوئی نمایا فرق نہیں ہے " کو نامنظور کیا جاتا ہے۔اسطرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ انکی تدریسی مہارتوں میں قابل ذکر اثر پڑتا ہے۔

5۔ بی۔ایڈ طالب علموں کے تدریسی رویّے کے حوالے سے انکی تدریسی مہارتوں میں حیرت انگیز تبدیلی دکھی ، اور یہ ثابت ہوا کہ صفر مفروضہ " بی۔ایڈ طالب علم کی تدریسی مہارت کا انکے تدریسی رویّے کے قبل از اور بعد از امتحان کے اسکور میں کوئی نمایا فرق نہیں ہے " کو نامنظور کیا جاتا ہے۔ اسطرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ انکی تدریسی مہارتوں میں قابل قبول اثر دیکھنے کو ملا ہے۔

6۔ بی۔ایڈ طالب علموں کی کلّی تدریسی مہارتوں کے شروعاتی اور آخری مرحلے کے اسکور میں حیرت انگیز تبدیلی دکھی ،اور یہ ظاہر ہو گیا کہ صفر مفروضہ "بی۔ایڈ طالب علم کی کلّی تدریسی مہارت کا ان کے

قبل از اور بعد از امتحان کے اسکور میں کوئی نمایا فرق نہیں ہے" کو مسترد کر دیا گیا، اسطرح یہ واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ انکی کلّی تدریسی مہارتوں میں قابل ذکر اضافہ آیا ہے۔

- مطالعہ کے اہم نتائج۔
- 1۔ "بی۔ایڈ طالب علم کے تدریسی علم کا تدریس اور اکتساب کے حوالے سے مطالعہ کرنا"۔

Ø ماحصل 1 : نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ اسکول انٹرن شِپ پروگرام میں شرکت کا ان طالب علموں کے تدریس اور اکتساب سے متعلق علم تدریس میں شماریاتی لحاظ سے نمایاں طور پر بہتری دیکھی گئی ہے۔

- 2۔" بی۔ایڈ طالب علم کے تدریسی علم کا اسکول کے نظم ونسک کے حوالے سے مطالعہ کرنا"۔

Ø ماحصل 2: نتائج نے اس بات کو نمایاں کیا کہ انٹرن شِپ پروگرام کا ان طالب علموں کی اسکول منیجمنٹ کے حوالے سے علمِ تدریس میں ایک اہم تبدیلی کی ہے۔

- 3۔ "بی۔ایڈ طالب علم کے کلّی تدریسی علم کا مطالعہ کرنا"۔

Ø ماحصل 3: نتائج نے اسکول انٹرنشِپ پروگرام کے بارے میں معلم طلباء کے علم میں ایک قابل ذکر اضافہ کا انکشاف کیا۔ اس طرح، اسکول انٹرنشِپ پروگرام کا معلم طلباء کے کلّی علمِ تدریس کو نمایاں طور پر متاثر کرتی ہے۔

- 4۔" بی۔ایڈ طالب علم کی تدریسی مہارت کا تدریسی معاون اشیاء کے استعمال کے حوالے سے مطالعہ کرنا"۔
- ماحصل 4۔نتائج نے تدریسی معاون اشیاء کے استعمال کے لحاظ سے معلم طلباء کی تدریسی مہارتوں پر اسکول انٹرن شپ کے مثبت اثرات کو اجاگر کیا۔
- 5۔"بی۔ایڈ طالب علم کی تدریسی مہارت کا ان کے تدریسی رویّے کے حوالے سے مطالعہ کرنا"۔

Ø ماحصل 5 : نتائج سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان طالب علموں کے تدریسی مہارتوں پر انٹرنشپ پروگرام کا خاصہ اثر دکھا اور معلم طلباء کے تدریسی ہنر اور مہارتوں میں نمایاں تبدیلی آتی دکھی۔

- 6۔"بی۔ایڈ طالب علم کی کلّی تدریسی مہارت کا مطالعہ کرنا"۔

Ø ماحصل 6: نتائج نے اسکول انٹرن شِپ پروگرام کے بارے میں معلم طلباء کی تدریسی مہارت میں ایک قابل ذکر اضافہ کا انکشاف کیا۔ اس طرح، اسکول انٹرنشِپ طالب علموں کی کلّی تدریسی مہارت کو نمایاں طور پر متاثر کرتی ہے۔

• اختتامی کلمات (Concluding lines)۔ تدریس ایک ایسا پیشہ ہے جو معاشرے کی تخلیق میں ہمیشہ سے اہم کردار ادا کرتا آیا ہے۔ تعلیم حاصل کرنا ہر انسان پہ فرض ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ماں کی گود سے لیکر قبر جانے تک تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ ایک بچّے کی تعلیم ماں کے گود سے ہی شروع ہو جاتی ہے، ماں بچّے کی تربیت پہ دھیان دینے لگتی ہے۔ جس طرح والدین اپنے بچّوں کی تربیت کرتے ہیں، اسی طرح اسکول میں طالب علموں کی تربیت اور اقدار کی رہنمائی میں استاد کی اہم حصّہ داری ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ معلّم کی شخصیت، علم و مہارت کی نظر ثانی کی جائے۔ اس مقالے کا مقصد ان طالب علموں پر جو موجودہ وقت میں قبل ملازمت اساتذہ تعلیم کے اداروں میں اساتذہ بنّے کے لیے ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں، ان پر اسکول انٹرنشپ پروگرام کے اثر کا پتہ لگانا ہے۔ محققہ نے محاصلات کی فراہمی کے لیے تجرباتی تحقیق کا استعمال کیا اور یہ پایا کہ یہ پروگرام مستقبل کے اساتذہ کی علم اور مہارت میں مثبت تبدیلی رونماں کرتا ہے اور انکے پیشہ ورانہ فروغ میں مددگار ثابت ہوتا ہے، ان مستقبل کے اساتذہ کو ایک قابل اور ذمّہ دار حقیقی اساتذہ بننے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

• حوالہ جات (References)

Guidelines for Effective Organization of .(2017)NCERT. School Internship Programme at Elementary Level. Framework and :School Internship .((2016 NCTE Guidelines. National Council for Teacher Education. Hans Bahadur Shah Zafar Marg, New 1.((II Bhawan Wing www.ncte-india.org.Delhi-110002, National Council for Teacher Education. .((2017 NCTE Bahadur Shah.((IIInternship Scheme. Hans Bhawan Wing

anilshukla@ncte-india.Zafar Marg, New Delhi-110002, National Curriculum Framework for Teacher.(2010)NCTE. Education Towards Preparing Professional and Humane Teacher. New Delhi.

'Preservice Teachers.(2017)Tai, H. N.&NGHIA, T. L. H. Identity Development during the Teaching Internship. pp.No. 8, 42,-Australian Journal of Teacher Education. Vol 15.-1

Internship Program in .(2012) Mirza, N. & Saleha, P. Effectiveness Problems and Prospects. :Education 2-International Journal of Learning and Development, Vol 98.-pp. 487,(1)

Teacher.(2015)Mohanty, R.K.&Saxena, R.N. Mishra, B.K. Education. Bhagwati Printers. Meerut.Revised edition.

☆☆☆

انجمن دبستان ہمالہ اور کلچرل اکادمی کے اشتراک سے
"خطّہ پیر پنچال میں اردو ادب کے پچاس سال" کے عنوان سے جشن ادب کا اہتمام

رپورٹ: عمر فرحت
10، اکتوبر 2023

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر کے اہتمام اور ہمالین ایجوکیشن مشن راجوری کے باہمی اشتراک سے 11-10 اکتوبر 2023 کو ایک عظیم الشان دوروزہ جشنِ ادب بعنوان ''خطہ پیر پنچال میں اردو ادب کے پچاس سال'' کا انعقاد کیا گیا۔ اس جشنِ ادب کی افتتاحی نشست کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر قدوس جاوید نے کی جبکہ شری راجیو کھجوریہ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر راجوری بحیثیت مہمانِ خصوصی تقریب میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ پروفیسر محمد اسداللہ وانی، ڈاکٹر ٹی-آر-رینہ، جناب خالد حسین، جناب احمد شناس مہمانان گرامی کے طور پر ادبی جلسے میں موجود رہے۔ ہمالین ایجوکیشن مشن راجوری کے سرپرست اعلیٰ جناب فاروق مضطر بحیثیت میزبان اعلیٰ اور جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی کی طرف سے سربراہ ڈیوزنل آفس کشمیر ڈاکٹر فاروق انوار مرزا بطور میزبان اجلاس میں موجود رہے۔ دوروزہ جشنِ ادب کے آغاز میں ہمالین ایجوکیشن مشن راجوری کے کوآرڈنیٹر جناب محمد مسلم نے والہانہ انداز میں تقریب میں آئے ہوئے مہمانوں کا استقبال کیا اور فرداً فرداً خطہ پیر پنچال سے آئے ہوئے مقتدر شخصیات کا تعارف پیش کیا۔

بعدازاں ایڈیٹر شیرازہ اردو محمد سلیم سالک نے اکیڈمی کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا بھرپور خاکہ پیش کیا اور اس دوروزہ جشنِ ادب کے اغراض و مقاصد کو بھی مدلل انداز میں پیش کیا۔ اجلاس میں جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی کی طرف سے سربراہ ڈیوزنل آفس کشمیر ڈاکٹر فاروق انوار مرزا نے تقریب میں آئے ہوئے مہمانوں کا رسمی طور استقبال کیا اور ہمالین ایجوکیشن مشن راجوری کے سرپرست اعلیٰ جناب فاروق مضطر کے تعاون کے لیے شکریہ ادا کیا۔ اس افتتاحی نشست کے دوران ڈاکٹر محمد آصف ملک علیمی نے اپنا مفصل کلیدی مقالہ بہ عنوان ''خطۂ پیر پنچال میں اردو ادب کے پچاس سال'' پیش کیا۔ اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کرنے والے اس مقالہ کو حاضرین نے بے حد سراہا ہے۔ تقریب میں شیرازہ اردو کی خصوصی اشاعتوں کی رسم رونمائی انجام دی گئی، جن میں ''پروفیسر مجید

مضمر نمبر، پروفیسر ظہور الدین نمبر، شیرازہ سفر نامہ نمبر جلد 1 اور 2، عبد الرحمٰن مخلص نمبر، تاجران کتب نمبر، اور سال نامہ ہمارا ادب کا خاص نمبر فن افسانہ نگاری نمبر جلد 1 اور 2 شامل ہیں اور اکیڈمی مطبوعات میں سے انتخاب کلام سید رضا، کشمیر کی قدیم ذاتیں، کشمیر فوک لور کے آئینے میں اور مونوگراف غلام نبی غنی گورگانی قابل ذکر ہیں۔

اس موقعے پر خطۂ پیر پنچال کے نامور شعرا جناب خورشید بسمل کے تازہ شعری مجموعہ ''ضوفشاں'' اور جناب احمد شناس کا تازہ شعری مجموعہ'' آب رنگ'' اور بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی کے پروفیسر شمس کمال انجم کی تصنیف ''یومیات'' کی نقاب کشائی کی گئی۔ اس کے علاوہ دبستانِ ہمالہ، ہمالین ایجوکیشن مشن راجوری کے ادبی مجلّے ''دھنک'' اور جناب فاروق مضطر کی ترتیب و تدوین کردہ کتاب ''گل سرسبد'' اور ''ادبیات پیر پنچال'' از جاوید انور کی رسم رونمائی بھی انجام دی گئی۔ علاوہ ازیں اس نشست میں قومی اور علاقائی سطح پر جن اردو زبان وادب کے معتبر محققین، ناقدین، ادبا و شعرا کو دبستان ہمالہ کی جانب سے اعزازات سے نوازا گیا۔ ان میں پروفیسر ایاز رسول نازکی، ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینہ، جناب احمد شناس، جناب اسیر کشتواڑی اور پروفیسر اسد اللہ وانی کو ہمالین لاف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ 2023 سے نوازا گیا۔ جناب منشور بانہالی، ڈاکٹر لیاقت جعفری، جناب خالد کرار، ڈاکٹر شمس کمال انجم اور پروفیسر ریاض احمد کو فخر ہمالہ ایوارڈ 2023 سے نوازا گیا۔ جناب عبد الغنی جاگل، ڈاکٹر زمرد مغل، ڈاکٹر لیاقت نیّر، ڈاکٹر محمد آصف ملک علیمی اور ڈاکٹر عبد الحق نعیمی کو فخر پیر پنچال ایوارڈ 2023 سے نوازا گیا۔

اس افتتاحی نشست کی نظامت ایڈیٹر اردو محمد سلیم سالک نے انجام دی۔ دوروزہ جشن کے دوسرے حصے میں محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر ایاز رسول نازکی نے کی جبکہ پروفیسر شمس کمال انجم نشست میں بطور مہمان ذی وقار موجود رہے۔ اس مشاعرے میں ممتاز احمد ممتاز، ڈاکٹر لیاقت نیّر، عبد القیوم نائیک، روبینہ میر، خورشید جانم، ڈاکٹر شمس کمال انجم، راج کمار چندن، ڈاکٹر امجد علی بابر، عارف ملک، لیاقت جعفری، خورشید بسمل، پرویز ملک، وکیل احمد حیات، عمر فرحت، غنی غیور، پروفیسر ایاز رسول نازکی، ڈاکٹر علمدار عدم، قاری ضیاء الحق نے اپنا کلام پیش کیا۔ اس مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر علمدار عدم نے انجام دی۔ دوروزہ جشن ادب کے پہلے دن کے آخری حصے میں ایک مذاکرہ اور مباحثے کا انعقاد کیا گیا جس کا موضوع ''خطۂ پیر پنچال میں اردو ادب کی تنقید و تحقیق'' تھا۔ مذاکرے کی صدارت جناب ولی محمد اسیر کشتواڑی نے کی جبکہ معروف محقق ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینہ بطور مہمان خاص نشست میں موجود رہے۔

اس مذاکرے میں ڈاکٹر آصف ملک علیمی، ڈاکٹر عبدالحق نعیمی اور ڈاکٹر لیاقت نیّر نے حصہ لیا۔ اس دوران سوالات کا سلسلہ بھی چل پڑا جس میں صف سامعین میں شریک مقتدر شخصیات نے حصہ لیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں جناب ولی محمد اسیر کشتواڑی نے دوروزہ جشن ادب کے اہتمام کے حوالے سے منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کی سنجیدہ کانفرنسیں منعقد کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے اور مذاکرے کے حوالے سے پرمغز اور مفید گفتگو کی۔ ساتھ ہی موصوف نے موضوع کے حوالے سے کئی اہم نکات کی طرف متوجہ کیا اور ڈاکٹر محمد اقبال لون نے نظامت کے فرائض انجام دئے۔ تقریب کے دوران علم وادب اور زندگی کے مختلف طبقات کے ساتھ تعلق رکھنے والی مقتدر شخصیات اور ہمالین کالج راجوری کے طلبا و طالبات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ آخر میں مہمانوں کا شکریہ محمد سلیم سالک نے ادا کیا۔ دوروزہ جشن ادب کو کامیاب بنانے کے لئے دبستان ہمالہ راجوری کے کوآرڈی نیٹر محمد مسلم وانی، پروگرام کوآڈ نیٹر ڈاکٹر محمد اقبال لون، امتیاز احمد شرقی اور محمد آصف خان نے کلیدی رول ادا کیا۔

11 اکتوبر 2023ء

''دوروزہ جشن ادب'' کے دوسرے روز ممتاز ہم عصر سے ملیے کے تحت اردو کے نامور شاعر جناب احمد شناس سے ایک ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔ اس نشست کی صدارت پروفیسر قدوس جاوید نے کی جبکہ نوجوان قلمکار عرفان عارف نے اردو اور ڈاکٹر محمد سلیم نے انگریزی میں جناب احمد شناس کی شاعری پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ بعدازاں جناب احمد شناس نے اپنی حیات اور اپنے تخلیقی سفر پر مفصل روشنی ڈالی۔ علاوہ ازیں اس نشست میں سوال و جواب کا سلسلہ بھی چلا، جس میں نشست میں شامل شرکا نے موصوف سے ان کی زندگی اور تخلیقی سفر کے بارے میں استفسارات کیے۔ اس نشست کی خاص بات یہ رہی کہ ہمالین ڈگری کالج کے طلبا و طالبات اور اساتذہ کرام نے بھرپور شرکت کی اور نظامت محمد سلیم سالک نے انجام دی۔ اس نشست کے فوراً بعد ایک ادبی مذاکرہ بعنوان ''خطہ پیر پنچال میں اردو شاعری کے پچاس سال'' منعقد کیا گیا۔ اس نشست کی صدرات جناب ایاز رسول نازکی نے کی جبکہ مذاکرے میں ڈاکٹر لیاقت جعفری، جناب انور خان اور جناب غنی غیور بحیثیت پینلسٹ شامل رہے۔ مذاکرے میں موضوع کے حوالے سے بحث بھی ہوئی۔

محمد سلیم سالک نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ تیسری نشست ''محفل افسانہ'' منعقد ہوئی جس کی صدارت اُردو اور پنجابی کے قدآور افسانہ نگار جناب خالد حسین نے کی جبکہ گوجری اور اردو

کے معروف ادیب پروفیسر ایم۔ کے۔ وقار بطور مہمان خاص موجود رہے۔ جن افسانہ نگاروں نے افسانے پڑھے ان میں جناب خالد حسین، جناب مرزا اسلم، ڈاکٹر جنید جاذب، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، محترمہ زنفر کھوکھر، پروفیسر ایم۔ کے۔ وقار اور جناب اقبال شال شامل ہیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد اقبال لون نے انجام دیئے۔ محفل افسانہ کے بعد ''خطہ پیر پنچال میں اردو فکشن کے پچاس سال'' کے عنوان سے تیسرا مذاکرہ منعقد ہوا۔ اس نشست کی صدارت ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے کی جبکہ ڈاکٹر رضوانہ شمسی، ڈاکٹر جنید جاذب اور ڈاکٹر عبدالرشید منہاس بحیثیت پینلسٹ مذاکرہ میں شامل رہے۔ نظامت کے فرائض محمد سلیم سالک نے انجام دئے۔

''جشن ادب'' کے اگلے حصے میں چوتھے مذاکرے کا انعقاد کیا گیا، جس کا عنوان ''خطۂ پیر پنچال میں اردو ادبی صحافت کے پچاس سال'' تھا۔ صدارت ممتاز شاعر اور ادیب پروفیسر ایاز رسول نازکی نے کی۔ اس نشست میں ڈاکٹر زمرد مغل اور ڈاکٹر لیاقت جعفری پینلسٹ کے طور پر موجود رہے۔ اس دوران سوالات کا سلسلہ بھی چل پڑا جس میں صف سامعین میں تشریف فرما معزز شخصیات نے حصہ لیا۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر ایاز رسول نازکی نے مذاکرے کے حوالے سے جامع اور معنی خیز گفتگو کی۔ موصوف نے ادبی صحافت کے حوالے سے کئی اہم نکات کی طرف سامعین کو متوجہ کیا۔ ڈاکٹر محمد اقبال لون نے نظامت کے فرائض انجام دئے۔ دوروزہ جشن کے آخر میں اردو مشاعرہ جناب احمد شناس کی صدارت میں منعقد ہوا جبکہ ایوان صدرات میں پروفیسر اسداللہ وانی، جناب منشور بانہالی، جناب ذوالفقار نقوی اور محترمہ رضیہ حیدر موجود رہے۔ مشاعرہ میں جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ان میں ذوالفقار نقوی، سلیم خان، رضیہ حیدر، رشید قمر، احمد شناس، وکیل احمد حیات، خالدہ بیتاب، منشور بانہالی، ساحل عمران، خورشید جانم قابل ذکر ہیں جبکہ مشاعرے کی نظامت عرفان عارف نے کی۔ مشاعرے کے بعد جناب مسلم وانی نے دبستان ہمالہ کی طرف سے کلچرل اکادمی کے ذمہ داروں کی عزت افزائی کرتے ہوئے مومنٹو پیش کئے۔

ساتھ ہی دیگر مہمانوں کی حوصلہ افزائی کی، جن میں ڈاکٹر جنید جاذب، عرفان عارف، جناب وکیل حیات، ڈاکٹر رضوانہ شمسی، جناب ذوالفقار نقوی، خالدہ بیتاب قابل ذکر ہیں۔

☆☆☆